مولانا مودودی کے غلط نظریات

از رُوئے

قرآن، حدیث، سُنت انبیاء علیہم السلام اور عقلِ عام

معہ ضمیمہ

ماخوذ از "منصب نبوت" تالیف مولانا ابوالحسن علی ندوی

— از —

کریم الدین ریٹائرڈ انجینئر

شائع کردہ

جاوید اکیڈمی (گوشہ عافیت) چہلیک ملتان

فون ۷۲۶۷۵

منشی عبدالرحمٰن خان

کا

علمی و فکری سرمایہ

۱	تعارفِ قرآنی	5/50	۱۲	آئینہ ملتان	20/-
۲	بصائر قرآنی	5/50	۱۳	سیرت اشرف	30/-
۳	احکام قرآنی	12/50	۱۴	انداز سخن	25/
۴	داستان عمل	15/50	۱۵	تعمیر پاکستان و علمار ربانی	15/-
۵	آداب علم و اخلاق	7/50	۱۶	عورت انسانیت کے آئینہ میں	12/-
۶	آداب حقوق العباد	6/50	۱۷	انسانیت حیوانیت کی راہ پر	15/-
۷	حقائق و معارف	12/-	۱۸	اقبال اور مسٹر	5/-
۸	خضر و مسیحا	9/-	۱۹	مشاہدات و واردات	12/-
۹	بازار رشوت	7/-	۲۰	حقیقت حدیث و فتنہ پرویز	7/-
۱۰	حدیث دل جشن رحمٰن	13/50	۲۱	بہار رفتہ	40/-
۱۱	جام جاوید	3/-	۲۲	حقیقتوں کے چراغ	25/-

ترتیب و تہذیب

خطبات حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحہ

۲۳	دنیا و آخرت	25/	۲۸	دین و دنیا	25/-
۲۴	میلاد النبی	25/-	۲۹	علم و عمل	25/-
۲۵	حقوق و فرائض	25/-	۳۰	نظام شریعت	25/-
۲۶	حقیقت مال و جاہ	25/-	۳۱	حقیقت عبادت	25/-
۲۷	فضائل صوم و صلوٰۃ	25/-	۳۲	فضائل صبر و شکر	25/-

۳۳ حقیقت تصوف و تقویٰ 25/-

——— ملنے کا پتہ ———

جاوید اکیڈمی (گوشۂ عافیت) چہلیک ملتان

منشی عبدالرحمٰن خان

کا

علمی و فکری سرمایہ

۱	تعارف قرآنی	5/50	۱۲	آئینہ ملتان	20/-
۲	بصائر قرآنی	5/50	۱۳	سیرت اشرف	30/-
۳	احکام قرآنی	12/50	۱۴	انداز سخن	25/
۴	داستان عمل	15/50	۱۵	تعمیر پاکستان و علمار بانی	15/-
۵	آداب علم و اخلاق	7/50	۱۶	عورت انسانیت کے آئینہ میں	12/-
۶	آداب حقوق العباد	6/50	۱۷	انسانیت حیوانیت کی راہ پر	15/-
۷	حقائق و معارف	12/-	۱۸	اقبال اور مسٹر	5/-
۸	خضر و مسیحا	9/-	۱۹	مشاہدات و واردات	12/-
۹	بازار رشوت	7/-	۲۰	حقیقت حدیث و فتنہ پرویز	7/-
۱۰	حدیث دل جشن رحمٰن	13/50	۲۱	بہار رفتہ	40/-
۱۱	جام جاوید	3/-	۲۲	حقیقتوں کے چراغ	25/-

ترتیب و تہذیب

خطبات حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحہ

۲۳	دنیا و آخرت	25/	۲۸	دین و دنیا	25/-
۲۴	میلادالنبی	25/-	۲۹	علم و عمل	25/-
۲۵	حقوق و فرائض	25/-	۳۰	نظام شریعت	25/-
۲۶	حقیقت مال و جاہ	25/-	۳۱	حقیقت عبادت	25/-
۲۷	فضائل صوم و صلوٰۃ	25/-	۳۲	فضائل صبر و شکر	25/-

۳۳ حقیقت تصوف و تقویٰ 25/-

——— ملنے کا پتہ ———

جاوید اکیڈمی (گوشۂ عافیت) چہلیک ملتان

اشاعت اوّل ———— جولائی ۱۹۷۶ء
تعداد ———— ایک ہزار
قیمت ———— چھ روپے
مطبع ———— سید الیکٹرک پریس ملتان

ناشر

جاوید اکیڈمی، چہلیک، ملتان

فون نمبر ۷۵۶۲۷

فہرست

ضمیمہ

آغازِ سُخن

نیشنل ماڈل فیکٹری جدہ ـــــ کے چند پاکستانی ملازمین کی ایک مختصر مجلس میں ایک روز اتفاق سے ـــــ مولانا مودودی ـــــ کا تذکرہ آگیا۔ احقر نے جو اس مجلس میں موجود تھا کہا کہ وہ واقعی غیر معمولی قابلیت کے آدمی ہیں اور ان کی جماعت سے اکثر جدید تعلیم یافتہ مسلم نوجوانوں کو فائدہ بھی بہت پہنچا ہے مگر ان کی ـــــ تعبیرِ دین ـــــ صحیح نہیں ہے۔ ایک صاحب (جو بعد میں معلوم ہوا کہ جماعت اسلامی سے منسلک ہیں) بولے کہ آپ اس کے بارے میں مولانا مودودی کو لکھیں، اگر آپکی باتیں صحیح ہوں گی تو وہ فوراً مان لیں گے، ورنہ آپ کو آپ کی غلطی دلائل سے سمجھا دیں گے۔

احقر کو بھی یہ خیال ہوا کہ کسی مفکر کے نظریات کو دور سے غلط کہتے رہنا کافی نہیں بلکہ اس کو ان غلطیوں پر مطلع کرنا چاہیئے، اگر وہ رجوع کرے فبہا ورنہ دوسرے ہی اُن پر غور کر کے اُن میں مبتلا ہونے سے بچیں۔ اس اعتبار سے بلاشبہ یہ ایک تبلیغی قسم کی دینی خدمت ہوگی

احقر نے گو مولانا مودودی کا لٹریچر معتدبہ مقدار میں پڑھ رکھا تھا، مگر یہاں وہ موجود نہ تھا صرف دو کتابچے ـــــ تحریکِ اسلامی کی اخلاقی بنیادیں ـــــ اور ـــــ حقیقتِ حج ـــــ دستیاب ہو سکے اس کے علاوہ تفسیر بیان القرآن اور شیخ الحدیث مولانا ذکریا صاحب مدظلہ کا تبلیغی نصاب بھی موجود تھا بس انہیں کی مدد سے ایک مختصر مضمون مولانا کے بنیادی نظریات پر لکھنے کا ارادہ کر لیا جو باوجود اختصار کی بہت کوشش کے خاصہ کتابچہ ہو گیا۔ اس میں مولانا کی ان باتوں کا جن کو عموماً اچھالا جاتا ہے مثلاً صحابہؓ کرام پر تنقید، تصوف کا انکار، تقلیدِ ائمہ اربعہ کا عدم التزام وغیرہ کا قطعاً ذکر نہیں کیا گیا، بلکہ ساری بحث ان کے اس نظریہ پر ہے کہ ـــــ دین کا حقیقی مقصود حکومتِ صالحہ کا قیام ہے جس کے لئے جہاد پر

بہت زور دیا گیا ہے اور نماز روزہ حج و زکوٰۃ کو اسکے ٹریننگ کورس کی حیثیت سے فرض کیا گیا ہے"۔ ـــــ مگر تعجب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اتنا بڑا قرآن نازل فرمایا مگر اس مقصود حقیقی کا کہیں ذکر تک نہ کیا اور نہ یہ مقصود مولانا مودودی کے علاوہ گذشتہ تقریباً ساڑھے تیرہ سو سال میں اکابرینِ امت میں سے کسی کے ذہن میں آیا۔ چونکہ ہر مسلمان کو اس بنیادی چیز پر غور کرنا چاہئے پس یہ مضمون عام ضرورت کا بھی ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ کچھ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اس نے احقر سے اس مضمون کی تکمیل کرائی مسودہ تیار ہونے پر اس کی ایک نقل مولانا ممدوح کی خدمت میں بھیجی گئی مگر انہوں نے اس کو ایک خط کیساتھ لوٹا دیا جس کی نقل اس کتابچہ میں قارئین کرام ملاحظہ فرمادیں گے۔ جس سے یہ ثابت ہے کہ مولانا اس سلسلہ میں افہام و تفہیم کا دروازہ بند فرما چکے ہیں ـــــ مولانا مودودی کو مسودہ کی نقل بھیجنے کے بعد حسنِ اتفاق سے حضرت مولانا ـــــ ابوالحسن علی ندوی ـــــ سے جدہ میں ملاقات ہوئی اور ان کی تالیف ـــــ "منصب نبوت اور اس کے حاملین اولین" ـــــ مطالعہ میں آئی۔ اس میں بھی کچھ تذکرہ مولانا مودودی کی ایک کتاب کا تھا۔ احقر نے اس سے اقتباس کر کے اپنے کتابچہ کا برکت کے لئے اس کو ضمیمہ بنایا اور اس کتابچہ کو چھپوانے کی کوشش کی۔

احقر نے طباعت واشاعت کے کوچہ میں کبھی قدم نہیں رکھا تھا۔ مگر محترمی حبیب ـــــ منشی عبدالرحمٰن خانصاحب ـــــ جو ماشاءاللہ کئی قابل قدر کتب کے مصنف ہیں نے دستگیری فرمائی اور اس سلسلہ کا سارا کام اپنے ذمے لے لیا۔ اگر وہ اس بار کو اپنے سر نہ رکھتے تو احقر کی آواز عامۃ المسلمین کے کانوں تک نہ پہنچتی۔ اس کا اجر تو ان کو اللہ تعالیٰ ہی انشاءاللہ دیں گے۔ احقر تو ان کی خدمت میں اظہارِ تشکر و ممنونیت ہی کر سکتا ہے۔

احقر نے محض تبلیغ کی نیت سے اس کام میں وقت اور پیسہ صرف کیا ہے اگر اس سے ایک مسلمان کے خیالات کی بھی اصلاح ہوئی تو میں اپنی کوشش کو بارآور سمجھوں گا

احقر مولف

جدہ ۱۹/جون ۱۹۷۶ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْم

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ بانی جماعت اسلامی کی تعبیرِ دین کا قرآن، حدیث، سُنّتِ انبیاء علیہم السلام اور عقل کی روشنی میں

ایک بے لاگ فکری جائزہ

اعلیٰ تحریری و تقریری صلاحیت اپنی بات منوانے کا موثر ترین ذریعہ ہے

کسی ہائی سکول کے ہفتہ وار تقریری مقابلہ میں ایک بار تقریر کے لئے یہ موضوع دیا گیا تھا کہ سب سے زیادہ عجیب سواری کون سی ہے۔ کسی طالب علم نے ہوائی جہاز کو عجیب ترین سواری تبلاتے ہوئے تقریر کی، کسی نے ریل کو، کسی نے موٹر کار کو، ایک طالب علم نے بائیسکل پہ تقریر کی اور چونکہ بولنے کا ڈھنگ اچھا جانتا تھا۔ بائیسکل کے متعدد اوصاف بتا کر اس نے آخر میں کہا ـــــ "بھلا جو سواری بلا سہارے خود کھڑی بھی نہ ہو سکے وہ ایک آدمی کو اپنے اوپر بٹھا کر تیزی سے دوڑنے لگے۔ اس سے عجیب تر اور کون سی سواری ہو سکتی ہے"؟ ـــــ اس پر سامعین نے خوب تالیاں بجائیں اور مقابلہ میں اول نمبر اسی کا رہا۔ اگرچہ یہ بات منطقی لحاظ سے کچھ صحیح نہ تھی۔

اسی طرح ایک مولوی صاحب نے جو ایک مسجد کے لئے چندہ کر رہے تھے، اس مقصد سے عورتوں میں وعظ کیا۔ پہلے تعمیرِ مسجد کو بہت بڑا کارِ ثواب تبلایا۔ پھر فرمایا کہ فلاں مسجد ابھی تعمیر ہوئی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ تمہارا اس میں کچھ بھی حصہ نہ ہوا۔ عورتوں کو اس ثواب سے محروم رہ جانے پر بڑی حسرت و ملال ہوا۔ تو فرمایا ہاں بھئی خوب یاد آیا کہ ابھی اس میں فرش لگنا تو باقی ہی ہے اور نماز تو فرش پر ہی ہوتی ہے۔ تو تم فرش لگوانے میں حصہ لیکر جی بھر کر ثواب حاصل کر سکتی ہو، جب تمہارے بنوائے ہوئے فرش پر نمازی نماز پڑھیں گے اور فرشتے ان کو بارگاہِ الٰہی میں پیش کر کے کہیں گے کہ حضور یہ ہیں بندوں کی نمازیں اور بندیوں کی جانمازیں، تو اللہ تعالےٰ تم سے کس قدر خوش ہوگا۔ اور کس قدر اپنی رحمتیں تم پر نازل فرمائے گا۔ یہ سننا تھا کہ چندے کی بارش ہونے لگی۔ نقد بھی خوب ملا اور زیورات بھی۔ دیکھئے ایک شاعرانہ جملے نے کیسا کام دیا۔

غرض جس شخص کو بھی بولنے اور لکھنے کا ڈھنگ آتا ہو وہ بعض اوقات اپنی غلط بات کو بھی لوگوں سے منوا لینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس کی جادو بیانی کے سامنے زبانیں گنگ ہو جاتی ہیں اور دل و دماغ مسحور ہو کر اسی کی طرح سوچنے لگتے ہیں۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کی تعبیرِ دین

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی بھی غیر معمولی تقریری و تحریری صلاحیت رکھتے ہیں وہ قلم کے بادشاہ ہیں۔ بے پناہ فطری ذہانت کے ساتھ ساتھ ان کا مطالعہ بھی بہت وسیع ہے جس کا جیتا جاگتا ثبوت انہوں نے غالباً تیئیس۲۳ چوبیس۲۴ سال کی عمر میں ہی ــــ "الجہاد فی الاسلام" ــــ جیسی ضخیم کتاب لکھ کر دیا ہے جو غالباً اردو میں اپنی مثال آپ ہے۔ ان کا طرزِ تحریر ایسا شگفتہ برجستہ اور مسحور کن ہے کہ ان کی تصانیف کو پڑھتے وقت ان کی کسی بات کو رد کرنے کا خیال ہی نہیں آتا۔ اسی لئے جب انہوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں اپنے جدید دینی نظریات کے تحت ایک جماعت کی تشکیل کرنا چاہی تو بہت سے اعلیٰ صلاحیت رکھنے والے مسلمانوں نے ان کی آواز پر لبیک کہا۔ ان کی جماعت کا نصب العین شروع میں حکومت الٰہیہ کا قیام تھا۔ جس کو بعد میں بدل کر "اقامتِ دین" اس لئے کر دیا گیا کہ یہ اپنے مفہوم میں حکومتِ الٰہیہ سے وسیع تر ہے۔ خود ان کی اور ان کی جماعت کے دیگر اہلِ قلم حضرات کی تصانیف اس نظریہ کی حامل ہیں کہ ــــ "امامتِ صالحہ کا قیام ہی دین کا حقیقی مقصود ہے۔ اور جو لوگ اس راہ میں کوئی عملی جد و جہد نہیں کرتے وہ باوجود اپنے کمال اتباعِ شریعت و طریقت کے بھی اچھے مسلمان نہیں ہیں بلکہ ان کا ایمان ہی مشتبہ ہے" ــــ ذیل کے اقتباسات جو مولانا ممدوح کی صرف ایک پمفلٹ ــــ "تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں" ــــ سے لئے گئے ہیں ملاحظہ ہوں!

۱ ــــ "پھر دیکھئے کہ آخر اس دین میں جہاد کو اتنی اہمیت کیوں دی گئی ہے کہ اس سے جی چرانے اور منہ موڑنے والوں پر قرآن نفاق کا حکم لگاتا ہے؟ جہاد نظامِ حق کی سعی ہی کا تو دوسرا نام ہے۔ یا بالفاظ دیگر جس کے دل میں ایمان ہوگا وہ نہ تو نظامِ باطل کے تسلط پر راضی ہو سکتا ہے اور نہ نظامِ حق کے قیام کی جد و جہد میں جان و مال سے دریغ کر سکتا ہے۔ اور اگر کوئی اس معاملہ میں کمزوری دکھاتا ہے تو اس کا ایمان ہی مشتبہ ہے پھر بھلا کوئی دوسرا عمل اسے کیا نفع پہونچا سکتا ہے؟

اسلام کے نقطۂ نظر سے امامتِ صالحہ کا قیام مرکزی اور مقصدی اہمیت رکھتا ہے، اور جو شخص اس دین پر ایمان لایا ہو اس کا کام صرف اتنے پر ہی ختم نہیں ہو جاتا کہ اپنی زندگی کو حتی الامکان اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرے بلکہ عین اس کے ایمان کا تقاضا ہے کہ وہ اپنی تمام سعی و جہد کو اس ایک مقصد پر مرکوز کر دے کہ زمامِ کار کفّار و فُسّاق کے ہاتھ سے نکل کر صالحین کے ہاتھ میں آئے اور وہ نظامِ حق قائم ہو جو اللہ کی مرضی کے مطابق دنیا کا انتظام درست رکھے۔ پھر چونکہ یہ مقصدِ اعلیٰ اجتماعی کوشش کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا، اس لئے ایک ایسی جماعتِ صالحہ کا وجود ضروری ہے جو خود اصولِ حق کی پابند ہو اور نظامِ حق کو قائم کرنے، باقی رکھنے اور ٹھیک ٹھیک چلانے کے سوا دنیا میں کوئی غرض پیشِ نظر نہ رکھے۔ روئے زمین پر اگر ایک ہی آدمی مومن ہو تب بھی اس کے لئے یہ درست نہیں ہے کہ اپنے آپ کو اکیلا پا کر اور ذرائع مفقود دیکھ کر نظامِ باطل کے تسلط پر راضی ہو جائے یا ــــ اھون البلیتین ــــ کے شرعی حیلے تلاش کر کے غلبہ کفر و فسق کے ماتحت کچھ آدھی پونی زندگی کا سودا چکانا شروع کر دے بلکہ اس کے لئے سیدھا اور صاف راستہ صرف یہی ایک ہے کہ بندگانِ خدا کو اس طریقِ زندگی کی طرف بلاتے جو خدا کو پسند ہے پھر اگر کوئی اس کی بات سن کر جواب نہ دے تو اس کا ساری عمر صراطِ مستقیم پر کھڑے ہو کر لوگوں کو پکارتے رہنا اور پکارتے پکارتے مر جانا اِس سے لاکھ درجہ بہتر ہے کہ وہ اپنی زبان سے وہ صدائیں بلند کرنے لگے جو ضلالت میں بھٹکی ہوئی دنیا کو مرغوب ہوں اور ان راہوں پر چل پڑے جن پر کفار کی امامت میں دنیا چل رہی ہو۔ اور اگر کچھ اللہ کے بندے اس کی بات سننے پر آمادہ ہو جائیں تو اس کے لئے لازم ہے کہ ان کے ساتھ مل کر ایک جتھا بنائے اور یہ جتھا اپنی تمام اجتماعی قوت اس مقصدِ عظیم کے لئے جد و جہد کرنے میں صرف کر دے جس کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ حضرات مجھے خدا نے دین کا جو تھوڑا بہت علم دیا ہے اور قرآن و حدیث کے مطالعہ سے جو کچھ بصیرت مجھے حاصل ہوئی ہے۔ اس سے میں دین کا تقاضا یہی کچھ سمجھا ہوں، یہی میرے نزدیک کتاب الٰہی کا مطالبہ ہے۔ یہی انبیاء کی سنت ہے اور میں اپنی اس رائے سے ہٹ نہیں سکتا جب تک کوئی خدا کی کتاب اور رسول کی سنت ہی سے مجھ پر یہ ثابت نہ کر دے کہ دین کا یہ تقاضا نہیں ہے" (صفحہ ۱۰ تا ۱۲)

۲ ــــ حقیقی تقویٰ اور مصنوعی تقویٰ کا فرق دو شخصوں کی مثال سے واضح فرماتے ہیں

۔ جن میں ایک کے اندر طہارت اور نظافت کی حس موجود ہو اور دوسرے کے اندر حس تو موجود نہ ہو بلکہ وہ طہارتوں اور گندگیوں کی ایک فہرست لئے پھرتا ہو۔ وہ فہرست میں درج گندگیوں سے تو سخت اجتناب کرے گا مگر بے شمار ایسی چیزوں میں آلودہ پایا جائیگا جو اس فہرست والی گندگیوں سے بدرجہا زیادہ ناپاک ہوں۔ صرف اس وجہ سے کہ وہ اس کی فہرست میں درج ہونے سے رہ گئیں ....

یہ ایک نظری فرق نہیں ہے بلکہ آپ اس کو اپنی آنکھوں سے ان حضرات کی زندگیوں میں دیکھ سکتے ہیں جن کے تقویٰ کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ ایک طرف انکے ہاں جزئیات شرع کا یہ اہتمام ہے کہ داڑھی ایک خاص مقدار سے کچھ بھی کم ہو تو فسق کا فیصلہ نافذ کر دیا جاتا ہے۔ پائجہ ٹخنے سے ذرا نیچے ہو جائے تو جہنم کی وعید سنا دی جاتی ہے اور اپنے مسلک فقہی کے فروعی احکامات سے ہٹنا ان کے نزدیک گویا دین سے نکل جانا ہے لیکن دوسری طرف دین کے اصول اور کلیات سے ان کی غفلت اس درجہ کو پہنچی ہوئی ہے کہ مسلمانوں کی پوری زندگی کا مدار انہوں نے رخصتوں اور سیاسی مصلحتوں پر رکھ دیا ہے اقامت دین کی سعی سے گریز کی بے شمار راہیں انہوں نے نکال رکھی ہیں ....

انہیں کی غلط رہنمائی نے مسلمانوں کو اس چیز پر مطمئن کیا ہے کہ ایک غیر اسلامی نظام کے اندر رہتے ہوئے بلکہ اس کی خدمت کرتے ہوئے بھی ایک محدود دائرہ میں زندگی بسر کرکے وہ دین کے سارے تقاضے پورے کر سکتے ہیں اور اس سے آگے کچھ مطلوب نہیں ہے جس کے لئے وہ سعی کریں پھر اس سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ اگر کوئی ان کے سامنے دین کے اصلی مطالبے پیش کرے اور سعی اقامت دین کی طرف توجہ دلائے تو صرف یہی نہیں کہ وہ اس کی بات سُنی ان سُنی کر دیتے ہیں بلکہ کوئی حیلہ کوئی بہانہ اور کوئی چال ایسی نہیں چھوڑتے جو اس کام سے خود بچنے اور مسلمانوں کو بچانے کے لئے استعمال نہ کریں۔ اس پر بھی ان کے تقویٰ پر کوئی آنچ نہیں آتی اور نہ مذہبی ذہنیت رکھنے والوں میں سے کسی کو یہ شک ہوتا ہے کہ ان کے تقویٰ میں کوئی کسر ہے۔ اس طرح حقیقی اور مصنوعی تقویٰ کا فرق بے شمار شکلوں میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ مگر آپ اُسے تب ہی محسوس کر سکتے ہیں جب کہ تقویٰ کا اصلی تصور آپ کے ذہن میں واضح طور پر موجود ہو۔

(ص: ۵ تا ۲۱ ط)

۳ ——— حقیقتِ احسان کے سلسلہ میں فرماتے ہیں :——

"جو اپنے نفس کو اور عام مسلمانوں کو غیر اسلامی نظام کے غلبہ پر اصولاً اور عملاً مطمئن کر دیں، ان کا شمار آخر محسنین میں کس طرح ہو سکتا ہے اور اس جرم عظیم کے ساتھ یہ بات انہیں احسانؔ کے مقام کے مقام عالی پر کیسے سرفراز کر سکتی ہے کہ وہ چاشت، اشراق اور تہجد کے نوافل پڑھتے رہے، ذکر و شغل اور مراقبے کرتے رہے، حدیث و قرآن کے درس دیتے رہے، جزئیات فقہ کی پابندی اور چھوٹی چھوٹی سنتوں کے اتباع کا سخت اہتمام فرماتے رہے اور تزکیۂ نفس کی خانقاہوں میں دینداری کا وہ فن سکھاتے رہے جس میں حدیث و فقہ اور تصوف کی باریکیاں تو ساری موجود تھیں مگر ایک نہ تھی تو وہ حقیقی دینداری جو ——— سر داد نہ داد دست در دستِ یزید ——— کی کیفیت پیدا کر دے اور ——— بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا ——— کے مقام وفاداری تک پہنچائے ....

کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ (خدا) داڑھیوں کا طول، ٹخنوں اور پائنچوں کا فاصلہ تسبیحوں کی گردش اوراد و وظائف اور نوافل و مراقبے کے مشاغل اور ایسی ہی چند اور چیزیں دیکھ کر ہی دھوکہ کھا جائیگا کہ آپ اس کے سچے وفادار اور جان نثار ہیں؟ (ص ۵۵، ۵۷)

۴ ——— بعض لوگوں کے اس خیال کا بھی مجھے علم ہوا کہ انہیں جماعت میں اس چیز کی بڑی کمی محسوس ہوتی ہے جس کو وہ "روحانیت" سے تعبیر کرتے ہیں مگر شاید خود نہیں بتا سکتے کہ وہ فی الواقع ہے کیا شے؟ ان بنا پر ان کی رائے یہ ہے کہ نصب العین اور طریق کار تو اس جماعت کا اختیار کیا جائے اور تزکیۂ نفس اور تربیت روحانی کے لئے خانقاہوں کی طرف رجوع کیا جائے یہ ساری باتیں صاف بتاتی ہیں کہ ابھی تک ہماری تمام کوششوں کے باوجود لوگوں میں دین کا فہم پیدا نہیں ہوا ہے، میں ابھی آپ کے سامنے ایمان، اسلام، تقویٰ اور احسان کی جو تشریح عرض کر چکا ہوں۔ اس میں اگر کوئی چیز قرآن اور حدیث کی تعلیم سے تجاوز کر کے میں نے خود وضع کر دی ہو۔ تو آپ بے تکلف اس کی

لہ "احسانؔ کی تعریف جو حدیث جبرئیلؑ کے مطابق ہم جیسے عامیوں کے کان میں پڑی ہے وہ تو یہ ہے کہ "خدا کی عبادت اس طرح کرنا گویا تم اسے دیکھ رہے ہو یا کم از کم اس تصور کیساتھ کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے" مولانا نے جو مفہوم احسان کا لیا ہے وہ ان کا خود ساختہ ہے۔

نشان دہی فرمادیں۔ لیکن اگر آپ تسلیم کرتے ہیں کہ کتاب اور سنت رسولؐ کی رو سے یہی ان چاروں چیزوں کی حقیقت ہے تو پھر خود ہی سوچیے کہ جہاں ایمان کی متقضیات بھی پوری طرح متحقق نہ ہوں اور جہاں تقویٰ اور احسان کی جڑ ہی نہ پائی جاتی ہو۔ وہاں آخر کون سی روحانیت پائی جاتی ہے جسے تلاش کرنے آپ جارہے ہیں۔" (ص ۵۵-۵۹)

احقر عرض کرتا ہے کہ اقتباسات بالا کے لحاظ سے گذشتہ تقریباً تیرہ سو سال کے تقریباً تمام مسلمان ناقص ہی نظر آتے ہیں۔ بلکہ اگر زیادہ کاوش کی جاوے تو خود دورِ صحابہ کے بھی بہت سے حضرات معاذ اللہ ایسے ہی ٹھہریں گے کیونکہ انہوں نے دنیا بھر سے نظام ہائے کفر کو مٹا کر امامت صالحہ قائم کرنے میں کوئی خاص جدوجہد نہ کی ہوگی۔ پھر ان بزرگان دین، علماء اور مشائخ کا تو پوچھنا ہی کیا جنہوں نے نظام کفر کے تحت زندگیاں گزاری ہیں، ان کا تو مولانا کی کسوٹی پر ایمان بھی مشتبہ ہی ٹھہرے گا۔

ان خیالات کا اہل جماعتِ اسلامی پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ جس کے تحت بعض نے یہاں تک کہہ ڈالا ——

"دورِ صحابہؓ کے بعد مسلمانوں میں کوئی شخص ایسا پیدا نہیں ہوا جس نے اسلام کو مولانا مودودی کی طرح ٹھیک ٹھیک سمجھا ہو۔"

"میں حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے مسلک کو غلط سمجھتا ہوں۔"

کسی کے دریافت کرنے پر کہ آپ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ اور دوسرے چوٹی کے علماء کی بابت کیا خیال رکھتے ہیں تو امیر جماعت (غالباً مولانا ابو اللیث صاحب) نے فرمایا کہ۔

"چونکہ ان حضرات نے اقامتِ دین کی کوئی کوشش نہیں کی ہے۔ لہٰذا بندہ نہیں ہے معتقد کسی شیخ و شاب کا"

مولانا منظور احمد نعمانیؒ کے کسی ممبر پارلمنٹ اچھے پکے مسلمان کی نسبت دریافت کرنے پر کسی رکن جماعت اسلامی نے بے دھڑک کہا ——

"ہم تو ان کو ایسا ہی سمجھتے ہیں جیسا جواہر لال یا پٹیل کو۔"

جس پر مولانا منظور صاحب کو بہت غصہ آیا اور انہوں نے اس رکن جماعت کو یہ کہکر ڈانٹا کہ

چند اردو کے رسالے پڑھکر تمہاری یہ جرأت ہوئی۔ میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ تم ان رسالوں کو بھی نہیں سمجھتے۔

یہ روایات میں نے محض یادداشت سے " روایت بالمعنی " کے طور پر کی ہیں اگر کسی صاحب کو ضرورت ہو تو میں صحیح حوالہ بھی دے سکتا ہوں جہاں انکو دیکھا جا سکتا ہے انشاءاللہ کوئی فرق نہ ہوگا۔

مولانا مودودی کے نظریات کی تنقید سے علماء کرام کا تغافل اور علماء و عوام سبھی کا غلط ردِّ عمل

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا مولانا مودودی کے نظریات کے اعتبار سے بڑے بڑے اکابرین ملت کی بزرگی تو کجا ان کا ایمان بھی مشتبہ نظر آتا ہے یہ خیال اگر غلط ہے اور یقیناً غلط ہے تو پھر کیا علماء کرام کا فرض نہ تھا کہ وہ اس کی باقاعدہ تردید کرتے تاکہ مولانا مودودی کو اپنی رائے پر نظرثانی کی ضرورت پڑتی جیسا کہ انہوں نے کہا ہے کہ وہ اپنی رائے سے اس وقت تک نہیں ہٹ سکتے جب تک کوئی قرآن اور سنتِ رسولؐ سے ہی یہ ثابت نہ کر دے کہ دین کا یہ تقاضا نہیں ہے جو انہوں نے سمجھا ہے۔ یہ کام علماء کرام ہی کے کرنے کا تھا کیونکہ وہی قرآن اور حدیث کے زیادہ سمجھنے والے ہیں۔ اس پر بھی اگر مولانا مودودی اپنی رائے سے رجوع نہ فرماتے تو کم ازکم ان پر اور ان کی طرف رجوع ہونے والوں پر اتمام حجت ہی ہو جاتا اور بلا شبہ ان کی طرف رجوع ہونے والوں کی تعداد میں معتدبہ کمی ہو جاتی۔

مگر افسوس ہے کہ مولانا مودودی میں کیڑے تو بہت نکالے گئے مثلاً یہ کہ وہ آئمہ اربعہ کی تقلید اپنے اوپر کیا کسی بھی لکھے پڑھے مسلمان پر لازم نہیں سمجھتے بلکہ گناہ یا اس سے بھی بدتر کوئی چیز سمجھتے ہیں۔ وہ داڑھی کی شرعی مقدار کو ضروری نہیں سمجھتے نہ خود شرعی داڑھی رکھتے ہیں (پہلے کا ذکر ہے اب ماشاءاللہ وہ شرعی داڑھی رکھتے ہیں) ان کی بیوی ملازموں سے پردہ نہیں کرتی۔ وہ کار اور بنگلہ رکھتے ہیں۔ وہ پیری مریدی کے سخت خلاف ہیں اور تصوف کو " چنیا بیگم " اور ہندوؤں کا جوگ بتلاتے ہیں۔ وہ کوئی دستار بند عالم نہیں۔ وہ قرآن کی تفسیر بالرائے کرتے ہیں۔ وہ خدا اور رسولؐ کے سوا نہ کسی کو معیارِ حق مانتے ہیں اور نہ کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہونا چاہتے ہیں اور نہ کسی کو تنقید سے بالاتر سمجھتے ہیں

بلکہ بلا تکلف صحابہؓ کرام تک پر تنقید کرتے ہیں۔ اپنی مشہور کتاب ـــــ خلافت و ملوکیت ـــــ میں انہوں نے حضرت علیؓ تک کی غلطی کا ذکر کیا ہے۔ ان کی جماعت کو امریکہ سے مالی امداد ملتی ہے۔ وہ اقتدار کے بھوکے ہیں۔ وہ محض ایک سیاسی آدمی ہیں اور ان کی جماعت ایک سیاسی جماعت ہے وہ دوسروں کی اصلاح تو کیا کریں گے خود اپنی ہی اصلاح کے محتاج ہیں وغیرہ وغیرہ۔

ان کے خلاف جو لٹریچر بھی احقر کی نظر سے گزرا مثلاً جماعت اسلامی اور مسئلۂ تقلید (مفتی محمود حسن صاحب) کشفِ حقیقت (مظاہر العلوم سہارنپور) قولِ فیصل (مصنف کا حوالہ یاد نہیں رہا) تحریکِ جماعت اسلامی کا ایک تحقیقی مطالعہ (مصنفہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ایم بی بی ایس ایم اے اسلامیات سابق رکن جماعت اسلامی پاکستان) "الفرقان" لکھنؤ کا تقریباً چوبیس سال پرانا ایک خاص نمبر جو جماعت اسلامی کے خلاف تو نہیں مگر چند قابل اعتراض چیزیں اہل جماعت اور غیر اہل جماعت کی بیان کر کے دونوں کو مفید مشورہ دیتا ہے، مولانا کوثر نیازی کا جماعت سے مستعفی ہونے سے قبل مولانا مودودی کے نام ایک طویل خط (جو قومی آواز لکھنؤ میں پورا مع مولانا مودودی کے جواب میں شائع ہوا تھا۔ جس میں مولانا نے مولانا کوثر نیازی کو استعفا دے دینے کا مشورہ دیا تھا۔) مکتوباتِ شیخ الاسلام جس میں مولانا حسین مدنیؒ صاحب نے جماعت اسلامی پر بارہ[۱۲]، تیرہ[۱۳] اعتراضات فرمائے تھے ان سب میں سے کسی میں بھی مولانا مودودی کے نظریات کی جن کو وہ صحیح دین بتلاتے ہیں دلائل سے تردید نہیں کی گئی اور یقیناً کسی شخص کی ذاتی کمزوریوں کے اعلان، قطع نظر اس سے کہ وہ کمزوریاں فی الواقع اس میں ہیں بھی یا نہیں، سے یا اس کی بنائی جماعت کی حالت میں اصولی تغیرات اور قابلِ اعتراض طرزِ عمل کے بیان سے بانی جماعت کے بنیادی نظریات کی تردید تو نہیں ہو جاتی جس کو اصل مقصود بنانا چاہیئے تھا ـــــ البتہ صرف جناب وحید الدین خانصاحب سابق رکن جماعت نے ہی اپنی ـــــ تعبیر کی غلطی ـــــ نامی ضخیم کتاب میں اس موضوع پر کافی بحث کی ہے۔ مگر وہ طویل اور دوسرے مسائل سے مخلوط ہونے کی وجہ سے ایسی ہے کہ ہم جیسا عامی آدمی اس میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔

مولانا مودودی کے نظریات یا تعبیر دین کا ایک فیصلہ کن جائزہ لینے کی ضرورت اور احقر کا باوجود اپنی علمی بے بضاعتی کے اس موضوع پر قلم اٹھانا

غرض ایک مختصر مضمون کی جس

میں مولانا کے نظریات یا تعبیرِ دین کا قرآن، حدیث اور عقل کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہو۔ ضرورت باقی کی باقی رہتی ہے اور جب وہ حضرات جو اس کے اہل ہیں کسی وجہ سے اس اہم چیز سے بے اعتنائی برت رہے ہیں تو پھر "قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند" کے مصداق مجھ جیسے بے علم اور غیر موزوں شخص کو ہی مقاصد ذیل کے تحت مجبوراً اس پر قلم اٹھانا پڑ رہا ہے۔

۱ ـــــ اپنے نفس کو یکسو اور مطمئن کرنے کے لئے جو عرصے سے بعض جماعت اسلامی والوں کے اعلیٰ کردار، اونچی علمی استعداد اور ایک جاندار لٹریچر سے متاثر ہو کر جماعت اسلامی میں شامل ہونے پر احقر کو اکساتا رہا ہے اور جن مختلف تردیدی دلائل سے نفس کی اس خواہش کو بروئے کار نہیں لایا گیا۔ ان کو یکجا جمع کرتا تاکہ مجھ جیسے حضرات کو غور کا مواد ہاتھ آئے اور ان پر حجت تمام ہو۔ مجھے اس مضمون کے لکھنے سے بڑا فائدہ ہوا ہے جس پر میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں سنا کرتا تھا کہ مشائخ بعض اوقات اپنے کسی مرید کی کسی اخلاقی کمزوری پر مطلع ہو کر اس کے ازالہ کی یہ تدبیر کرتے تھے کہ مرید سے اسی رذیلہ کے متعلق وعظ کہلوایا کرتے تھے چند بار کسی چیز کی برائی بیان کرنے اور اس پر سوچ سوچ کر دلائل قائم کرنے سے آدمی اپنے متعلق بھی غور کرتا ہے اور عموماً اس مرض سے نجات پا جاتا ہے۔ اس حقیقت کا مجھے مشاہدہ ہو گیا۔

۲ ـــــ مولانا مودودی صاحب کو اپنی رائے پر نظر ثانی کرنے کے لئے مواد فراہم کرنا۔ بعض اوقات کسی چیز کا کوئی خاص پہلو ایک بڑے علامہ کی نظر سے بھی اوجھل رہ سکتا ہے اور کسی عامی آدمی کے دماغ میں آ سکتا ہے، پس کیا عجب ہے کہ ایک عامی کی کوئی بات ایک مفکرِ اسلام کی سمجھ میں آجاوے اور انگریزی مقولہ "IT IS NEVER TOO LATE TO MEND" کے مصداق وہ اپنی رائے سے رجوع فرمائیں۔ خطا و نسیان سے کوئی بشر خالی نہیں ہے۔ حضورؐ نے فرمایا ـــــ

"تم سب خطا کار ہو اور بہترین خطا کار توبہ کرنے والے ہیں"

۳ ـــــ جماعت اسلامی سے اختلاف رکھنے والے علماء کرام کی خدمت میں اس غرض سے پیش کرنے کے لئے کہ وہ اس کا بالاستیعاب مطالعہ فرما کر اس کی تصحیح یا تغلیط جہاں ضرورت ہو، فرما دیں۔ بصورت اول مجھے اطمینان ہو جاویگا کہ میں اپنے خیال میں منفرد

نہیں بلکہ اکابر کے ساتھ ہوں اور بصورتِ دیگر میرے پیش کردہ دلائل کی غلطی ظاہر کرنے کے ساتھ یہ بھی بتلا دیں کہ ان کے علاوہ وہ دوسرے ٹھوس دلائل کیا ہیں جن کی بنا پر وہ جماعتِ اسلامی کو غلط سمجھتے ہیں۔ غرض یہ کہ میرے مضمون میں حسبِ ضرورت حذف و اضافہ ہو کر اس کی تصحیح و تکمیل ہو جائے۔

یہاں میں اس حقیقت کو بھی ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ قبولِ حق کی راہ میں جو رکاوٹیں عموماً لوگوں کو پیش آیا کرتی ہیں مثلاً اس کا مخالف کی زبان سے نکلنا۔ کسی کے زیرِ اثر ہونے کی وجہ سے اپنی عقل سے کام نہ لینا۔ بیجا قدامت پسندی قبول کر لینے میں سقوطِ جاہ کا اندیشہ، غور و فکر کی عادت ہی نہ ہونا یا مذہب کی کوئی اہمیت ہی نظر میں نہ ہونا جو کسی مذہبی بات کے غلط یا صحیح ہونے کی کھوج کی جائے احقر ان سب سے حسنِ اتفاق سے محفوظ ہے کیونکہ نہ تو مولانا مودودی کا مخالف ہے بلکہ بڑی حد تک ان کا مداح ہے نہ کسی کا مرید ہے گو اکابرِ دیوبند خصوصاً حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے عقیدت رکھتا ہے۔ کسی قسم کی کوئی ذاتی وجاہت ہی نہیں رکھتا جو سقوطِ جاہ کا خطرہ لاحق ہو بلکہ ایک معتدل مذہب کی بات کرتے رہنا یعنی بعض عقائدِ غیر ضروریہ کو بنا رِ منافرت باہمی بنانے سے لوگوں کو روکتے رہنے کی وجہ سے عموماً سب ہی کی نظر میں بے وقعت ہے اور ؎

شاکی ہیں مرے غیر بھی اور اپنے بھی نالاں
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

یا ؎ زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں

کا مصداق ہے، نہ قدامت پسند ہے اور نہ جدّت پسند بلکہ حق پسند ہے خواہ وہ کافر ہی کی زبان سے نکلے اور چونکہ احقر نے مذہب کو لامذہبی کے بعد قبول کیا ہے اسی لئے کسی چیز کو قبول کرنے سے پہلے اسے خوب ٹھونک بجا کر دیکھ لینے کا عادی ہے ایسی صورت میں احقر کا تبصرہ قطعی بے لاگ ہوگا ساتھ ہی میں یہ بھی عرض کر دوں کہ میرا خود کو عامی یا بے علم وغیرہ کہنا ہرگز کسی کسرِ نفسی پر مبنی نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ احقر محض میٹرکولیٹ ہے اور دینی حیثیت سے اس کا مبلغِ علم حضرت تھانویؒ کی تفسیر بیان القرآن، تھوڑے مواعظ و ملفوظات اور چند کتابوں کے مطالعہ تک ہی محدود ہے۔ اس لئے مضمون ہذا

کو قارئین حضرات ادبی معیار پر نہ پرکھیں ——— اب اصل مضمون ملاحظہ فرمائیں

تعبیرِ دین پر اثر انداز ہونیوالا مولانا مودودی صاحب کا
اہم ترین نظریہ اور اس کا فکری جائزہ

یوں تو مولانا مودودی کی بہت سی باتوں پر لوگوں نے اعتراض کیا ہے۔ مگر احقر کے نزدیک وہ تعبیرِ دین جیسی اہم چیز پر اثر انداز نہیں ہوتیں۔ ان کا جو نظریہ ذہنی انقلاب کا باعث بنا اور جدید اور غیر مانوس سا معلوم ہو کر دل میں کھٹکتا ہے۔ اور ہر صحیح مذہب کے متلاشی مسلمان کو دعوتِ فیصلہ دیتا ہے۔ وہ صرف ایک ہی ہے، وہ یہ کہ ———

"دینِ اسلام کا حقیقی مقصود امامتِ صالحہ کا قیام ہے۔ یہی کتاب الہٰی کا مطالبہ ہے، یہی انبیاء علیہم السلام کی سنّت ہے۔"

اس کے علاوہ دو تحتی اور معاون نظریے بھی ہیں اول یہ کہ "جہاد نظامِ حق کی سعی ہی کا دوسرا نام ہے (تحریکِ اسلامی کی اخلاقی بنیادیں)، یعنی انسان پر سے انسان کی حکومت مٹا کر خدائے واحد کی حکومت ——— قائم کرنے کے لئے تن من دھن کی بازی لگا دینا ہے (خطبات باب جہاد)"

دوسرا یہ کہ "نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ ارکان اربعہ جہاد کے تربیتی (TRAINING) کورس کی حیثیت سے رکھے گئے ہیں، مطلب یہ ہوا کہ ارکان اربعہ جہاد کے لئے اور جہاد نظامِ حق کے قیام کے لئے ہے جو اصل دین ہے۔ اسی نظریہ کے تحت جماعتِ اسلامی کا نصب العین قیام حکومتِ الٰہیہ یا اقامتِ دین ہے۔ ذیل میں ہم ان میں سے ہر ایک پر تفصیل سے کلام کریں گے۔

(۱)
کیا ارکانِ اربعہ جہاد کے ٹریننگ کورس کی حیثیت سے ہی فرض کیے گئے ہیں!

اگر مولانا ممدوح یہ کہتے کہ ارکان اربعہ جہاد کی صلاحیت پیدا کرنے میں مفید اور معین ہیں تو

ہمیں مناقشہ کی ضرورت نہ تھی مگر ان کی کتاب خطبات کے باب جہاد سے یہ بات آشکارا ہو جاتی ہے کہ مولانا کے نزدیک یہ محض جہاد کے ٹریننگ کورس کی حیثیت سے فرض کئے گئے ہیں۔ اگرچہ بعض منصف مزاج اہل جماعت بھی مولانا کے اس خیال کو غلط سمجھتے ہیں مگر اس غلطی کے اعلان اور کتاب میں ترمیم کرانے پر آمادہ نہیں ہوتے اس لئے اکثر اہل جماعت اس غلطی میں مبتلا ہیں اور حیرت ہے کہ بعض باوجود اپنی اونچی علمی استعداد کے اس غلط چیز کا پروپیگنڈہ اپنی تحریروں اور تقریروں میں کرتے رہتے ہیں لہٰذا ضرورت ہے کہ اس کی غلطی دلائل سے ثابت کی جاوے۔

نماز

قرآن مجید میں ـــــ اقم الصلوٰۃ لذکری ـــــ آیا ہے کہ میری یاد کے لئے نماز قائم کرو نہ کہ جہاد کی ٹریننگ دینے کی غرض سے اور فرمایا ہے ـــــ ان الصلوٰۃ تنھا عن الفحشاء والمنکر ـــــ بیشک نماز فواحش و منکرات سے روکتی ہے۔ یہ بھی فرمایا ـــــ ولذکر اللہ اکبر ـــــ یعنی اللہ کا ذکر جس کی نماز اعلیٰ فرد ہے، بہت بڑی چیز ہے اس کے علاوہ حزن کو زائل یا کم کرنے کے لئے صبر اور نماز سے مدد لینا بھی آیا ہے۔ قرآن میں نماز کا ذکر سات سو بار آیا ہے۔ مگر کہیں اس کے مقصود بالجہاد ہونے کے خیال کا شائبہ تک نہیں پھر اس کے غلط ہونے کیا شبہ ہے۔؟ قرآن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب امم سابقہ پر فرض تھی جب کہ جہاد سب پر فرض نہ تھا۔

اب احادیث کو لیجئے ـــــ

ا ـــــ احادیث میں کئی قصے اس مضمون کے وارد ہوئے ہیں کہ دو آدمی ساتھ ساتھ اسلام لائے ان میں سے ایک کسی غزوہ میں شہید ہو گیا دوسرا کچھ عرصہ بعد طبعی موت مر گیا۔ کسی صحابیؓ نے خواب میں دوسرے کو پہلے جنت میں داخل ہوتا دیکھا۔ حضورؐ سے عرض کیا کہ شہید کا درجہ تو افضل ہونا چاہیئے پھر غیر شہید اس سے پہلے جنت میں داخل ہوتا ہوا کیوں نظر آیا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ ان اعمال صالحہ کی وجہ سے جو اس نے پہلے کی شہادت کے بعد کئے۔ ایک حدیث میں یوں آیا ہے کہ دوسرے کی موت پر صحابہ کرام نے دعا کی کہ یا اللہ اس کو بھی درجہ میں شہید کے برابر کر دیجئے۔ حضور نے فرمایا کہ اس کے اتنے اعمال جو اس نے اس کی شہادت کے بعد کئے کہاں چلے جائیں گے؟ خدا کی قسم اس کا مرتبہ اس شہید سے کہیں زیادہ ہے اس سے معلوم ہوا کہ ارکان اربعہ خصوصاً نماز (کیونکہ غالباً دوسرے اعمال کی نوبت دونوں کی وفات

کے درمیان کم وقفہ ہونے کی وجہ سے نمازیں زائد ہوں گی) کی وجہ سے کسی کا درجہ شہید سے بڑھ سکتا ہے۔ ایک دوسری حدیث میں صاف یہ مضمون ہے کہ نماز افضل جہاد ہے پھر وہ جہاد کے ٹریننگ کورس کا حصہ کیسے ہو سکتی ہے۔

٢ ——— حضورؐ نے فرمایا کہ ——"میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے"—— جب کہ جہاد کی فضیلت میں ایسا نہیں فرمایا۔

٣ ——— شب معراج میں اللہ تعالےٰ نے نماز ہی کو فرض فرمایا، جہاد کو نہیں دوسرے قیامت میں سب اعمال سے پیشتر نماز ہی کی پوچھ ہوگی۔

روزِ محشر کہ جانگداز بود
اولین پرسشِ نماز بود

٤ ——— حضورؐ نے ایک مرتبہ صحابہؓ سے ارشاد فرمایا ——"کیا میں تم کو ایسی چیز نہ بتاؤں جو تمام اعمال میں بہترین چیز ہے اور تمہارے مالک کے نزدیک سب سے زیادہ پاکیزہ اور تمہارے درجوں کو بہت بلند کرنے والی اور سونے چاندی کو (اللہ کی راہ میں) خرچ کرنے سے بھی زیادہ بہتر اور جہاد میں تم دشمنوں کو قتل کرو وہ تم کو قتل کریں اس سے بھی بڑھی ہوئی"۔—— صحابہؓ نے عرض کیا ضرور بتائیں۔ آپ نے فرمایا ——"وہ اللہ کا ذکر ہے"

نماز چونکہ ذکر اللہ کی بہترین صورت ہے اس لئے وہ اس میں بدرجہ اولیٰ داخل ہوئی۔ ایک دوسری حدیث میں اس مضمون کیساتھ یہ بھی وارد ہے کہ ——"اگر کوئی شخص جہاد میں اس قدر تلوار چلائے کہ تلوار بھی ٹوٹ جائے اور وہ شخص بھی خون میں نہا جاوے تب بھی ذکر اللہ کرنے والا اس سے افضل ہے"۔

٥ ——— ایک حدیث میں ہے کہ جس شخص پر بخل کی وجہ سے (صدقات نافلہ میں) مال خرچ کرنا دشوار ہو یا بزدلی کی وجہ سے جہاد کی ہمت نہ پڑتی ہو اس کو چاہیئے کہ سبحان اللہ وبحمدہ کثرت سے پڑھا کرے ——— یہاں ذکر اللہ کو صدقات و جہاد کا بدل فرمایا۔ پس نماز بھی ذکر اللہ ہونے کی وجہ سے ان چیزوں کا بدل ہوئی۔ جو چیز جہاد کا بدل یا اس سے بہتر ہو اس کا ٹریننگ کورس کیسے ہو سکتی ہے! اگر اس حدیث سے کوئی یہ استدلال کرے کہ جہاد کا یہ

بدل بزدلوں کے لئے ہے تو میں کہوں گا کہ جب وہ جہاد کے اہل نہیں تو ان کو اس کی ٹریننگ میں شریک رکھنے کا کیا حاصل ہے۔ ٹریننگ سے تو ان کو بدرجہ اولیٰ خارج کر دینا چاہیئے مگر ایسا نہیں ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ نماز جہاد کا ٹریننگ کورس ہرگز نہیں ہے۔

۶ ـــــــ نماز کو معراج المومنین فرمایا گیا ہے۔ یہ شرف کسی اور عبادت کو حاصل نہیں ہے بھلا ایسی چیز جہاد کا ٹریننگ کبھی ہو سکتی ہے؟

۷ ـــــــ بعض نومسلموں کی عدم شرکت جہاد کی شرط کو حضورؐ نے منظور فرمایا، مگر نماز نہ پڑھنے کی شرط کو مسترد فرما دیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نماز جہاد سے اہم تر ہے۔

۸ ـــــــ بخاری اور مسلم کی حدیث میں سب سے زیادہ پسندیدہ عمل اللہ کے نزدیک نماز کو اس کے وقت پر پڑھنا، پھر ماں باپ کیساتھ نیکی کرنا پھر اللہ کی راہ میں جہاد کرنا آیا ہے ـــــــ صاف ظاہر ہے کہ نماز جہاد سے افضل ہے۔ اس لئے اس کا ٹریننگ کبھی نہیں ہو سکتی۔

اب عقلی دلائل سنیئے:۔ ـــــــ

۱ ـــــــ اگر نماز جہاد کے ٹریننگ کورس کا حصہ ہوتی تو عین معرکہ قتال میں ہرگز فرض نہ رہتی میدانِ جنگ میں جو کارکردگی کا وقت ہے قواعد پریڈ نہیں ہوا کرتی۔

۲ ـــــــ جب آدمی کسی قسم کے جہاد کے قابل نہ رہتا۔ اس پر فرض نہ رہتی مگر ایسا نہیں ہے۔ جب تک ہوش و حواس باقی رہیں نماز فرض رہتی ہے خواہ اشارہ ہی سے کیوں نہ ادا کی جائے۔ حتیٰ کہ مرتے وقت بھی اور اس وقت بھی جب آدمی سمندر میں تختہ پر بہ رہا ہو اور ڈوبنے کے قریب ہو۔

۳ ـــــــ جن پر جہاد بمعنی المعروف فرض نہیں ہے مثلاً عورتیں، ان پر ہرگز فرض نہ ہوتی اگر کوئی کہے کہ تبلیغ بھی جہاد ہے تو میں کہوں گا کہ اول تو ان کی تبلیغ کا دائرہ بہت محدود اور مختصر ہے ان کو تبلیغ کے لئے نکلنے کا حکم نہیں پھر بھی اگر بطور ٹریننگ کے فرض کی جاتی تو زیادہ سے زیادہ فرض کفایہ کا درجہ رکھتی حالانکہ وہ ان پر بھی بالکل اسی طرح فرض عین ہے جس طرح مردوں پر

۴ ـــــــ نمازِ باجماعت سے کچھ ایسا خیال ہو سکتا ہے کہ شاید یہ جہاد کا ٹریننگ ہو کیونکہ اس میں ایک امام فوجی کمانڈر کے قائم مقام سمجھا جا سکتا ہے جس کے حکم یا کاشن کا جماعت اتباع کرتی ہے۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو جماعت فرض ہوتی اور اس کے بلا نماز ادا ہی نہ ہو سکتی حالانکہ ثواب کی کمی کے

ساتھ وہ اکیلے بھی درست ہے نیز عورتوں پر بھی باقاعدہ جماعت یا تو علیحدہ فرض ہوتی یا مردوں کیساتھ ہی مسجد میں باجماعت ادا کرنا ان پر فرض ہوتا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے ان کی بہترین نماز اکیلے میں اپنے مکان کے سب سے اندرونی گوشہ میں بتلائی گئی ہے۔

۵ ــــــ ہر ٹریننگ کورس کی ایک حد ہوتی ہے۔ اور جس نے اس کی تکمیل کر لی ہو اس کے لیے اس کا باقاعدہ جاری رکھنا ضروری نہیں رہتا۔ اگر نماز کی بھی یہی حیثیت ہوتی تو ایک مدت کے بعد اس کا وجوب ساقط ہو جایا کرتا اور ایسے لوگ بطور معلم یا نگران کے کام کیا کرتے خود ان کو نماز پڑھنے کی ضرورت نہ ہوتی۔

۶ ــــــ اگر کسی کی کچھ نمازیں قضا ہو گئی ہوں اس پر ان کا ادا کرنا فرض ہے۔ حتیٰ کہ اگر ادا کر چکنے سے پہلے موت آنے لگے تو اس کو بقیہ قضا نمازوں کے فدیہ دینے کی وصیت کرنا چاہیئے۔ اگر نماز ٹریننگ کورس ہوتی تو اس تلافی مافات کی ضرورت نہ پڑتی۔ جس وقت سے بھی کوئی چاہتا اس کورس میں داخل ہو جایا کرتا۔ خصوصاً جب کہ ٹریننگ ہمیشہ ایک ہی دھرّے پر چلتا رہتا ہو۔ اور شمولیت میں تاخیر کرنے سے کچھ اسباق کے چھوٹ جانے کا اندیشہ نہ ہو۔

۷ ــــــ اگر نماز ٹریننگ کورس جہاد کا ہوتی تو بچپن ہی سے فرض کی جاتی تاکہ بالغ ہونے پر اگر جہاد کی ضرورت پڑے تو تربیت یافتہ آدمی ملے یہ کیا کہ جہاد اور اس کا ٹریننگ دونوں ساتھ ساتھ فرض ہوں اور بہت سے غیر تربیت یافتہ لوگوں کو جہاد میں شامل کرنا پڑے۔

۸ ــــــ نماز اگر واقعی ٹریننگ کورس ہوتی تو جو لوگ نمازیں بہت خضوع و خشوع کیساتھ پڑھتے ہیں وہ جہاد کے لئے زیادہ موزوں ہو جایا کرتے مگر مشاہدہ اس کی تائید نہیں کرتا۔ بہت سے بڑے نمازی تو قتال کے نام سے بھی کانپتے ہیں اور بعض بے نمازی اس میں بیدھڑک کود پڑتے ہیں۔

۹ ــــــ نماز ارکان اسلام سے ہے اور سب سے بڑا رکن ہے جب کہ جہاد ارکان اسلام سے نہیں پھر نماز جہاد کے تابع کیسے ہو سکتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وقتی طور پر جہاد سارے ہی ارکان سے افضل ہو جائے۔ یوں تو بعض اوقات پاخانہ جانا بھی نماز پر مقدم ہو جاتا ہے یا کسی اندھے کو کنویں میں گرنے سے بچانے کو نماز توڑ دینا فرض ہو جاتا ہے۔

دلائل بالا میں بعض دوسرے ارکان کے ٹریننگ نہ ہونے کے دلائل میں بھی درست ہیں اس

لئے ان کا اعادہ نہ کیا جاویگا ۔ قارئین خود ذہن میں رکھیں۔

نماز کے بارے میں ایک اہم مسئلہ کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرانا بے موقع نہ ہوگا ۔ کہ جماعت اسلامی والے نماز کو جہاد کا ٹریننگ کورس سمجھتے ہیں اس لئے ان کے پیچھے احقر کے خیال میں نماز مکروہ تحریمی ہے ۔ ٹھیک اسی طرح جیسے کوئی شخص نماز کو ورزش جسمانی کی نیت سے پڑھے اس کے پیچھے نماز نہ ہوگی ۔ یا جیسے کوئی شخص نفل پڑھ رہا ہو فرض پڑھنے والے کو اس کی اقتدا درست نہیں خواہ یہ لوگ کتنی ہی عمدگی سے نماز پڑھ رہے ہوں ۔ احقر کے دل میں جماعت اسلامی والوں کی بڑی قدر ہے مگر یہ اقتدا کا جواز تو نہیں بن سکتی ۔ اگر کسی مسجد یا دوسرے موقعہ پر امام اہل جماعت میں سے ہو تو احقر انتشار یا فتنہ پھیلانا پسند نہیں کرتا نماز جماعت کے ساتھ پڑھ لیتا ہے مگر بعد میں اس کا اعادہ بھی کرتا ہے ۔ ہاں ایسے اہل جماعت کے پیچھے شوق سے پڑھ لیتا ہے جس کی زبان سے اس ٹریننگ والے خیال کا غلط ہونا سُن لیا ہو۔

قرآنی دلائل ——————

روزہ

۱ —————— قرآن مجید میں روزہ کا فائدہ —————— لعلکم تتقون فرمایا گیا ہے یعنی اس سے متقی بننے کی امید ہے ، یہ نہیں فرمایا گیا کہ شاید تم میں جہاد کی صلاحیت پیدا ہو جائے ۔

۲ —————— یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں جس طرح تم سے قبل والی امتوں پر فرض کئے گئے تھے ۔ حالانکہ ان میں سے اکثر پر جہاد فرض نہیں کیا گیا تھا ۔ بلکہ احقر کا تو خیال ہے کہ قیام حکومت عادلہ کے لئے جہاد شاید ہی کسی پر فرض کیا گیا ہو ۔ اگر روزے ٹریننگ کورس کا سہ ہوتے تو ضرور جہاد بھی سب پر فرض کیا جاتا ۔

احادیث ——————

۱ —————— حضورؐ نے روزہ کو نفس اور شیطان کے حملوں کو روکنے کے لئے بمنزلہ سپر کے فرمایا ہے ۔ اس سے بھی وہ تقویٰ کا ٹریننگ ثابت ہوتا ہے نہ کہ جہاد کا ۔

۲ —————— ایک مشہور حدیث ہے کہ حضورؐ نے تین آدمیوں کے حق میں بد دعا فرمائی ہے اول وہ جس نے رمضان کا مہینہ پایا پھر بھی ٹھیک طریقہ سے روزے رکھکر اپنی مغفرت نہ کرائی دوسرا وہ جس کے سامنے حضورؐ کا ذکر آیا اور اس نے آپؐ پر درود نہ بھیجا ۔ تیسرا وہ جس نے اپنے والدین یا دونوں میں

سے کسی ایک کو بوڑھاپایا اور ان کی خدمت کر کے جنت حاصل نہ کی۔ دیکھئے ان میں ایسے شخص کا ذکر نہیں ہے۔ جس کو کسی جہاد میں شرکت کا موقعہ ملا پھر بھی وہ غازی یا شہید بلکہ جنت کا مستحق نہ بنا۔ اول الذکر تینوں قسم کے اشخاص پر رحم مجسم حضورؐ کی بددعا کی وجہ علمار محققین نے یہ بیان فرمائی ہے کہ یہ تینوں کام فی نفسہٖ سہل ہیں جو ان میں بھی کوتاہی کرے وہ کسی بڑے کام کو کیا انجام دے گا۔ جہاد چونکہ انتہائی عمل شاق ہے روزہ جیسا سہل کام اس کی ٹریننگ نہیں ہو سکتا۔

۳ ——— ایک حدیث میں ہے کہ روزہ کی جزا میں خود ہوں۔ ایک اور حدیث ہے کہ اور سب اعمال کا ثواب محدود ہے مگر روزہ کا لا محدود ہے۔ جب کہ جہاد کی فضیلت میں ایسے الفاظ نہیں آئے۔ پس روزہ جہاد کی ٹریننگ نہیں ہو سکتا گو وقتی طور پر جہاد ہر عبادت سے مقدم اور افضل ہو۔

۴ ——— حدیث میں ہے کہ جو شخص روزہ میں بے ہودہ باتیں اور بے ہودہ عمل ترک نہ کرے تو اللہ تعالےٰ کو اس کی ضرورت نہیں کہ وہ بھوکا پیاسا ہے۔ اگر روزہ جہاد کی ٹریننگ ہوتا تو بھوکا پیاسا رہنا ہی کافی ہوتا۔ پس لامحالہ یہ مسلمانوں میں تقویٰ اور دوسری صفاتِ حمیدہ پیدا کرنے کے لئے ہے۔ اب عقلی دلائل سنیئے :۔

عقلی دلائل

اگر روزہ جہاد کے ٹریننگ کورس کی حیثیت سے فرض کیا جاتا تو ہمیشہ ایسے موسم میں رکھا جاتا جس میں مشقت ہو۔

مثلاً ——— گرمیوں میں کھانے پینے کی مقدار پر پابندی ہوتی تاکہ بھوک پیاس برداشت کرنے کی عادت پڑے یا اس میں کوئی محنت کا کام کرنا بتلایا جاتا مگر ان سب چیزوں میں سے کوئی بھی نہیں رکھی گئی۔ چنانچہ اگر کوئی شخص دن بھر آرام سے ایئرکنڈیشنڈ کمرے میں مخملی گدے تکیوں میں سوتا ہے خواہ نماز بھی نہ پڑھے تاہم روزہ درست سمجھا جائے گا گو نماز نہ پڑھنے کا گناہ الگ سے ہو۔ غرض ہماری سمجھ میں تو نہیں آتا کہ محض کھانے پینے کے اوقات بدل دینے ہی سے جہاد کی ٹریننگ کا کوئی معتد بہ فائدہ ہو۔

یہ چیز بھی قابلِ غور ہے کہ اگر روزہ کی یہ حیثیت ہوتی تو دھوپیں والی خوشبو سونگھنے، منہ بھر کر قے کرنے، حقہ سگریٹ پینے، نسوار لینے وغیرہ سے ہرگز نہ ٹوٹا کرتا۔ نیز نماز کی طرح اس کا

بھی فدیہ دینا ضروری نہ ہوتا۔ کیونکہ فدیہ سے ٹریننگ کا مقصد بہر حال حاصل نہیں ہو سکتا۔ اب ان سب باتوں پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ روزے جہاد کے ٹریننگ کی حیثیت سے ہرگز فرض نہیں کئے گئے ہیں۔

زکوٰۃ

قرآن کے مطابق ——

۱ —— زکوٰۃ بھی نماز کے ساتھ ساتھ ہر خدائی مذہب میں فرض رہی ہے اگرچہ جہاد سب پر فرض نہیں رہا۔

۲ —— زکوٰۃ کی تاکید قرآن میں جہاد سے کہیں زیادہ اور تقریباً نماز کے برابر ہی آئی ہے۔

۳ —— زکوٰۃ کو نفوس میں پاکی اور پختگی پیدا کرنے والی بتلایا ہے اور رضاالٰہی کا ذریعہ بتلایا گیا ہے کہیں اشارۃً بھی تو یہ نہیں فرمایا کہ اس سے جہاد کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ غرض زکوٰۃ جہاد کے ٹریننگ کورس کی حیثیت سے فرض نہیں ہوئی۔

احادیث میں زکوٰۃ کو اموال کی پاکی کا ذریعہ بھی بتلایا گیا ہے۔ بھلا اموال کے پاک کرنے کو جہاد کی ٹریننگ میں کیا دخل ہے؟ زکوٰۃ روک لینے پر امساک باراں کا بھی حدیث میں ذکر ہے مگر جہاد کی صلاحیت نہ ہونے کا کہیں اشارۃ تک نہیں۔

عقلاً یوں سوچئے کہ ——

اگر کوئی فطری بزدل شخص زکوٰۃ میں اپنا سارا مال بھی دیدیا کرے تو کیا اس میں قتال کی ذرا سی بھی صلاحیت پیدا ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں، پھر یہ کیسا ٹریننگ ہے جو اصل مقصود میں ذرا بھی کام نہ آئے۔ نیز یہ ایک ایسی عبادت ہے جو صرف مالداروں پر فرض ہے اگر یہ جہاد کی ٹریننگ ہوتی تو سوائے جسمانی صحت سے معذور لوگوں کے جو نا قابل جہاد ہوں سب پر فرض ہوتی خواہ مقدار کم مقرر کر دی جاتی مگر شریعت کی رو سے یہ نا قابل جہاد یعنی معذور مالداروں پر تو فرض ہے اور ہٹے کٹے جہاد کے لئے موزوں غرباء پر فرض نہیں۔ کیا اس سے صاف ظاہر نہیں ہوتا کہ جہاد کا ٹریننگ کورس ہونے سے زکوٰۃ کا دور کا بھی تعلق نہیں۔

حج

قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ نے حج کو فرض تو اہل استطاعت پر ضرور قرار دیا مگر اس کا کوئی فائدہ بیان نہیں فرمایا۔ بلکہ یہ فرمایا کہ حج کے فوائد خود آکر دیکھ لیں۔ اس سے

معلوم ہوتا ہے کہ حج کے فوائد سن کر سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ جس طرح آم کا مزہ بلا چکھے کوئی نہیں جان سکتا۔ اگر حج جہاد کا ٹریننگ کورس ہوتا تو یہ فائدہ اللہ پاک آسانی سے بیان فرما دیتے۔

احادیث میں آیا ہے کہ جو شخص باوجود استطاعت کے حج نہ کرے خدا کو پرواہ نہیں کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا عیسائی گویا اس کے کافر ہو جانے کا احتمال ہے۔ جب کہ جہاد کے متعلق ایسی وعید نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ جو جہاد کا خیال تک دل میں نہ لایا اس کی موت ایک قسم کے نفاق پر ہوئی، سو اول تو کوئی ایسا مسلمان نہیں اور اگر ہو بھی تو یہ ہلکا سا نفاق بہر حال احتمال کفر سے اہون ضرور ہے۔ ایسی حالت میں حج کو جہاد کا ٹریننگ کورس کیسے سمجھا جا سکتا ہے۔

اب عقلی دلائل ملاحظہ ہوں ——————

۱ ——— اگر حج کسی درجہ میں بھی جہاد کی ٹریننگ ہوتا تو بڑھاپے سے قبل ہی اس کی ادائیگی کو فرض قرار دیا جاتا۔ یہ نہیں کہ قبر میں پیر لٹک رہے ہیں طواف اور سعی کی سکت نہیں۔ رمی جمار کرنا ممکن ہی نہیں لیکن حج کی فرضیت ادا کرنے جا رہے ہیں اور شرعاً یہ فرض سب حالتوں میں ادا سمجھا جاتا ہے بیشک بلا وجہ تاخیر کرنے کو برا کہا گیا ہے مگر عجلت کو فرض بھی قرار نہیں دیا گیا۔ اگر حج سے جہاد کی ٹریننگ کا کام لینا مقصود ہوتا تو اس قسم کے ناکارہ لوگوں کو ضرور حج سے روکا جاتا۔ پس صاف ظاہر ہے کہ حج کی یہ غرض نہیں۔

۲ ——— اگر یہ جہاد کا ٹریننگ ہوتا تو ذاتی طور پر فرض ہوتا۔ حج بدل کرانے یا اس کی وصیت کر جانا جائز نہ ہوتا۔ کسی شخص کا دوسرے کی طرف سے ٹریننگ لینا بے معنی ہے خصوصاً کسی مردے کی طرف سے اور جب کہ حج بدل کرنے والا اپنی ٹریننگ پہلے لے چکا ہو۔

۳ ——— حج اگر جہاد کی ٹریننگ کے لئے ہوتا تو احرام کی شکل بجائے درویشانہ یا عاشقانہ کے جیسا کہ مولانا خود بھی تسلیم فرماتے ہیں، کچھ عسکری قسم کی مقرر ہوتی۔ اس میں سر ڈھانپنے کی ممانعت نہ ہوتی۔ جہاد میں سر کھلا رکھنا بے معنی بلکہ مضر ہے۔ پیر کی ہڈی ڈھک لینے والے جوتے کی ممانعت نہ ہوتی جہاد میں ایسا جوتا بے کار ہے۔ خوشبو سونگھنے یا کھانے وغیرہ کی ممانعت نہ ہوتی۔ وضو میں بال ٹوٹنے کے اندیشہ سے داڑھی کے خلال کی ممانعت نہ ہوتی۔ عورتوں کو چہرہ پر کپڑا نہ لگنے دینا کی سخت تاکید نہ ہوتی کیونکہ ان چیزوں کو جہاد کی ٹریننگ سے کوئی واسطہ نہیں۔

۴ ــــــــ حالتِ احرام میں پانی کے شکار کی طرح خشکی کے شکار کی بھی اجازت ہوتی بلکہ چونکہ اس میں تیر وغیرہ چلانے کی ضرورت پڑتی ہے جس پر عسکری فعل کا اطلاق کسی درجہ میں ہو سکتا ہے۔ اس کی اجازت بدرجہ اولیٰ ہوتی خواہ حدود حرم کے باہر ہی ہوتی۔

۵ ــــــــ احرام کھلنے سے قبل حلق یا قصر کی قید نہ ہوتی، بھلا اس چیز کو ٹریننگ سے کیا نسبت۔

۶ ــــــــ وقوف عرفات و مزدلفہ و منیٰ میں، جیسے مولانا خود کیمپ کی زندگی تبلاتے ہیں کچھ عسکری افعال رکھے جاتے نہ کہ محض دعائیں ذکر اور تلبیہ، بلکہ تلبیہ کی کثرت، جس کا حکم ہے ٹریننگ کے لحاظ سے کچھ بے معنی سی معلوم ہوتی ہے۔ خصوصاً جب کہ ان چیزوں میں سے کوئی بھی فرض نہ ہو۔

۷ ــــــــ اگرچہ جہاد کا ٹریننگ کورس بلکہ بقول مولانا ٹریننگ کا تکملہ ہوتا تو بہتر یہ تھا کہ اسے سال میں صرف ایک دن ذی الحجہ میں رکھنے کی بجائے ہر مہینہ کی کسی خاص تاریخ میں رکھ دیا جاتا تاکہ زیادہ سے زیادہ مسلمان جلد از جلد اس ٹریننگ سے فارغ ہو سکیں اور کوئی بھی اس سے محروم نہ رہ سکے۔ سال میں صرف ایک بار مقرر ہونے سے آجکل اس قدر بھیڑ ہونے لگی ہے کہ حاجیوں کو بے حد تکلیف اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ حتیٰ کہ موتیں واقع ہو جاتی ہیں۔ نیز طمانیت اور نشاطِ قلب فوت ہو جاتا ہے۔ کیونکہ بعض اوقات پاخانہ پیشاب کے فطری تقاضے کو دبانا پڑتا ہے۔ یا پھر ایسی بے حیائی پر مجبور ہونا پڑتا ہے جس کی شرعاً کبھی اجازت نہیں ہو سکتی ان سب نشاطِ قلب فوت کرنے والی چیزوں سے ٹریننگ کا برائے نام مقصد بھی حاصل نہیں ہوتا۔ منیٰ میں جو لوگ عام خیموں میں یا کھلے آسمان کے نیچے پڑے رہتے ہیں ان کی عورتوں کو پردہ کی پابندی نبھانے میں سخت تعب ہوتا ہے۔ نیز طواف اور سعی کی بھیڑ میں پردہ کی پابندی نبھانا اور مردوں کی دھکم دھکا سے محفوظ رہنا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس لئے بعض عورتیں پردہ کو خیرباد کہہ دیتی ہیں جس کا برا اثر یہ بھی پڑتا ہے۔ کہ وہ اس کو غیر ضروری سمجھنے لگتی ہیں اور دلیل یہ پکڑتی ہیں کہ جب مقامات مقدسہ ہی میں پردہ نہیں رہ سکتا تو دوسری جگہ بھی اس کی کیا ضرورت ہے۔ یہی اثر بہت سی بے پردہ عورتوں کو دیکھ کر بھی پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اس ٹریننگ سے نفع کی بجائے نقصان

ہوتا ہے۔

۸ ———— خطبات میں مولانا فرماتے ہیں۔ کہ حج کے لئے دنیا بھر کی قوموں سے نکلے ہوئے لوگوں کے اجتماع میں ———— تمام قوموں کے لوگوں کا صاف دل کیساتھ ملنا۔ نیک اخلاق اور پاک خیالات کے ساتھ ملنا۔ خیالات، اعمال اور مقاصد کی یک جہتی کے ساتھ ملنا اور صرف ایک ہی دفعہ مل کر نہ رہ جانا۔ بلکہ ہمیشہ کے لئے ہر سال ایک مرکز پر اسی طرح اکٹھے ہوتے رہنا۔ دنیا میں امن قائم کرنے، قوموں کی دشمنیوں کو مٹانے اور لڑائی جھگڑوں کے بجائے محبت، برادری اور دوستی کی فضا پیدا کرنے کا اس سے بہتر نسخہ کس نے تجویز کیا ہے!"

مگر افسوس ہے کہ عملی طور پر ——"ملنا"—— قطعی نہیں ہوتا جس سے ان فوائد میں سے کوئی بھی حاصل ہو۔ ہاں اتنا ضرور ہوتا ہے کہ مختلف ممالک کے لوگوں کی شکلیں اور ان کے لباس معلوم ہو جاتے ہیں کہ ایسے ہوتے ہیں۔ مگر خالی صورتیں دیکھنے کو ملنا نہیں کہہ سکتے۔ ملنے کے معنی تو یہ ہیں کہ اختلاط اور تبادلہ خیالات کی نوبت آوے سو اول تو اختلاط کے مواقع ہی مناسک حج کی مشغولی کی وجہ سے نہیں ملتے اور اگر ملیں بھی تو زبانوں کا اختلاف ملاقات کو بے معنی بنا دیتا ہے۔ تبادلہ خیالات کی بجائے لڑائی جھگڑا البتہ دیکھنے میں آتا ہے۔ اسی لئے اللہ تعالےٰ نے حج کے ذکر میں —— ولا جدال فی الحج —— فرمایا ہے۔ کیونکہ انہیں خوب معلوم تھا کہ حج میں کچھ اور ہو یا نہ ہو یہ ضرور ہوگا۔ اس لئے لڑائی جھگڑا سے خصوصی ممانعت فرمائی۔ عرفات کا خطبہ جو اس عالمگیر اجتماع پر واقعی ایک مفید چیز ہو سکتی تھی۔ وہ بھی چونکہ عربی زبان میں ہوتا ہے۔ اس لئے محض عربی دان ہی اس سے کچھ فائدہ اٹھاتے ہوں گے۔ حج کے اجتماع میں مختلف رنگ ونسل مسلمانوں کا اختلاط تو درکنار ایک ملک کے حاجی بھی ایک دوسرے کے خیالات سے مستفیض ہونے کا موقع نہیں پاتے۔ حج کے پانچ چھ دنوں میں تو خیر فرصت ہی نہیں ملتی۔ ہر شخص مناسک حج کی تکمیل میں لگا رہتا ہے۔ اور نفسی نفسی کا عالم نظر آتا ہے۔ حج کے قبل یا بعد مکہ معظمہ کے قیام کے زمانہ میں بھی لوگ حرم میں پانچوں نمازیں بلکہ تہجد واشراق تک وہاں ادا کرنے کے لئے جانے میں کافی تھک جاتے ہیں آرام کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور باقی وقت میں کھانا پکانا۔ تلاوت قرآن اور درود و وظائف اور ذکر اللہ میں مشغولی باہم تبادلہ خیالات کا موقع کم ملنے دیتے ہیں۔ پھر نیک اور متقی قسم کے حضرات جن کی صحبت سے کچھ فائدہ اٹھایا جا سکے۔ حرمین شریفین کے قیام کے دوران عبادت پر اور زیادہ

حریص ہو جاتے ہیں۔ بعض بعض تو روزانہ ایک عمرہ اور پانچ سات طواف کرتے ہیں۔ بھلا پھر دوسروں کو اپنے مواعظ حسنہ سے مستفیض کرنے کی انہیں کب فرصت ہو سکتی ہے، غرض اس عالمگیر اجتماع کا اس اعتبار سے کوئی خاص فائدہ عملاً حاصل نہیں ہوتا۔ اور حج کی غرض مختلف قوموں کی عداوتیں مٹا کر دوستی کی فضا پیدا کرنا جو جہاد میں معین ہو، معلوم نہیں ہوتی۔ پس اس جہت سے بھی حج جہاد کا ٹرینگ نہیں ہو سکتا۔

۹ ـــــ مولانا نے خطبات میں حج اور اس کے مناسک کی حکمتیں بیان فرمائی ہیں۔ ذرا ان میں سے بعض کا جائزہ لیں۔

۱ ـــــ مولانا کعبہ کو اسلام کی عالمگیر تحریک کا مرکز تبلیغ واشاعت قرار دیتے ہیں اور حج کی غرض یہ بتلاتے ہیں کہ ایک خدا کو ماننے والے کھنچ کھنچ کر یہاں جمع ہوا کریں۔ مل کر خدا کی عبادت کریں اور اسلام کا پیغام لیکر پھر اپنے اپنے ملکوں کو واپس جائیں۔ سو ہمارے لئے یہ مرکز تبلیغ واشاعت نہیں بلکہ بیت اللہ ہے۔ نیز آجکل اسلام کا پیغام لینے کے لئے آنا بے معنی ہے، پیغام ریڈیو کے ذریعے نشر کیا جا سکتا ہے۔ اگر کہا جائے کہ بعض چیزیں نشر کرنے کی نہیں ہوتیں تو میں کہتا ہوں کہ ان کے لئے یہاں ایک تکلیف دہ بھیڑ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہر ملک کے ارباب حل وعقد ہی کا آنا کافی ہے۔

۲ ـــــ فرماتے ہیں کہ " احرام باندھنے کے بعد انسان کا خون بہانا تو درکنار جانور تک کا شکار کرنا حرام کر دیا گیا تا کہ امن پسندی پیدا ہو جائے۔ اور طبیعتوں پر روحانیت کا غلبہ ہو " اگر شکار نہ کرنے کو امن پسندی اور روحانیت پیدا کرنے میں واقعی کوئی دخل ہے تو پھر کبھی بھی اس کی اجازت نہیں ہونی چاہیئے۔ نیز خون بہانے کے معنی مار ڈالنے یا جان لے لینے ہی کے تو ہیں پھر پانی کے شکار کی یعنی مچھلی وغیرہ پکڑنے کی اجازت کیوں ہے کیا مچھلیوں میں جان نہیں ہوتی؟

۳ ـــــ احرام اور اس کی پابندیوں کے فوائد بتلاتے ہوئے فرماتے ہیں " ظاہر میں یہ (فقیرانہ) رنگ اختیار کرو گے تو باطن پر بھی اس کا اثر پڑے گا۔ اندر سے تمہارا دل بھی فقیرانہ سکینی اور امن پسندی پیدا ہو گی " ـــــ احقر کے نزدیک یہ فقیرانہ رنگ جہاد کا ٹرینگ نہیں ہو سکتا۔

۴ ——— رمی جمار کا مطلب مولانا کے نزدیک یہ ہے کہ "خدایا جو تیرے دین کو مٹانے اور تیرا بول نیچا کرنا چاہے گا۔ میں اس کے مقابلے میں تیرا بول بالا کرنے کے لیۓ یوں لڑوں گا۔" یہ صحیح نہیں، اگر ایسا ہوتا تو رمی جمار کے لیۓ بجائے تین کے ایک موقع اور بجائے تین چار دن یہ کام کرنے کے ایک ہی دن کرنا کافی ہوتا۔ پھر عورتوں، بوڑھے اپاہج اور معذوروں پر جن پر قتال فرض نہیں رمی جمار ہرگز فرض نہ ہوتا جو مناسک حج میں ایک سخت مشکل کام ہے۔ پھر اس پر بھی غور کرنا چاہیۓ کہ چنے برابر کنکریاں کسی ستون کی جڑ میں پانچ سات فیٹ کی دوری سے پھینکنے کو جہاد کی ٹریننگ میں کیا دخل ہو سکتا ہے؟ یا اس طرح بزعم خود خدا کی راہ میں لڑنے کا مدعی واقع میں بھی کسی درجہ میں اس قابل ہو سکتا ہے غرض رمی جمار کا یہ مطلب مضحکہ خیز ہے۔ نیز یہ مقصد تو کہیں بھی ایک پتھر رکھکر کنکریاں مارنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کے لیۓ اس قدر تعب اٹھانے کی کیا مار پڑی ہے! خدا تخیل کی ایسی بلند پروازی سے محفوظ رکھے۔

۵ ——— مولانا کی یہ ریسرچ کہ "رمی جمار دراصل ہاتھیوں والی فوج کی پسپائی کی یادگار ہے جو اللہ کے گھر کو ڈھانے آئی تھی، اور اس کو اللہ کے حکم سے چڑیوں نے پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا تھا" محض غلط اور بے بنیاد ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو رمی جمار واقعہ فیل کے بعد ہی شروع کیا جاتا۔ نیز ایک ہی ستون وادیٔ محشر پر اس کے لۓ بنایا جاتا نہ کہ جائے وقوع سے تقریباً دو میل کے فاصلہ پر ایک کی بجائے تین تین ستون قائم کۓ جاویں۔ ان ستونوں کا ذبح کبش کے موقعہ کے راستہ میں ہونا اور اس سے قریب ہونا اس بات پر صاف دلالت کرتا ہے کہ ان جمرات کا حضرت ابراہیمؑ کے واقعہ ہی سے تعلق ہے۔ نہ کہ ابرہہ کی فوج کی تباہی سے۔ نیز اس واقعہ فیل کے اعتبار سے بھی رمی جمار کی جو نیت مولانا نے تجویز فرمائی ہے وہ محض بے تکی ہے، کیونکہ ہاتھیوں والی فوج سے اہل مکہ قطعی نہیں لڑے بلکہ خود اللہ تعالے لڑے تو کیا آپ رمی جمار کرنے والے سے اللہ تعالےٰ کے فعل کی نقل کرانا چاہتے ہیں؟

۶ ——— منٰی میں رمی جمار کے بعد قربانی کی حکمت مولانا نے یہ بیان فرمائی ہے کہ "تاکہ راہِ خدا میں خون بہانے کی نیت اور عزم کا اظہار عمل سے ہو جاوے" یہ بھی صحیح نہیں اگر ایسا ہوتا تو عورتوں پر قربانی ہرگز فرض نہ ہوتی کیوں کہ ان پر قتال ہی فرض نہیں جو خون بہانے کا عزم کریں۔ نیز اگر قربانی اپنے ہی ہاتھ سے کرنا فرض ہوتا تو بھی یہ بات کسی حد تک صحیح ہوتی کہ خون بہانے کی عملی مشق کرائی جا رہی ہے۔ مگر حالت

یہ ہے کہ عموماً لوگ قربانی دوسروں سے اجرت دیکر کراتے ہیں۔ خصوصاً عورتیں تو شاذ و نادر ہی اپنے ہاتھ سے کرتی ہوں گی۔ بلکہ ان کے لئے تو مذبح میں جانا ہی دشوار ہے۔ تاہم ان سب لوگوں کی قربانی شرعاً درست سمجھی گئی ہے۔ گو افضل اپنے ہی ہاتھ سے کرنا ہے۔ یہ چیز صاف ظاہر کرتی ہے کہ قربانی کی غرض خون بہانے کا عملی اظہار نہیں ہے۔ ایک کیا ہزار جانوروں کی قربانی دوسروں کے ہاتھوں کرانے میں خون بہانے کی ذرہ برابر صلاحیت کسی میں پیدا نہیں ہو سکتی۔ —— نیز اگر قربانی کا یہی مقصد ہے تو پھر کسی بھی جانور کا ذبح کر دینا کافی ہے۔ گائے، بھینس، بھیڑ، بکری اور اونٹ کی ہی تخصیص بیکار ہے۔ مرغی ذبح کرنے سے بھی یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر چند کنکریاں کسی ستون پر مارنے سے خدا کی راہ میں لڑنے کے عزم کا اظہار ہو سکتا ہے تو مرغی ذبح کرنے سے خون بہانے کے عزم کا اظہار بدرجۂ اولیٰ ہوگا۔ بلکہ ہم خرما و ہم ثواب ہوگا۔ کیونکہ اس کا سب گوشت کام میں آجائیگا۔ جب کہ بڑے جانوروں کی قربانی کا تقریباً سارا گوشت زمین میں دفن کر دیا جاتا ہے اور محض برائے نام ہی کام میں آتا ہے۔ مولانا ممدوح کو کوئی بات کہنے سے پہلے اس کے ہر پہلو پر غور فرما لینا چاہیئے تھا۔

پھر مولانا ممدوح کو یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ رمی جمار جو کسی طرح بھی کسی جنگی کام کی عملی مشق نہیں کہلائی جا سکتی وہ تو فرض ہو اور قربانی اپنے ہاتھ سے کرنا جو خون بہانے کی عملی شکل کسی قدر ضرور ہے وہ دوسرے کے ہاتھ سے بھی جائز کر دی جائے۔ قربانی کو حضورؐ نے مسلمانوں کے باپ حضرت ابراہیمؑ کی سنت کہا ہے۔ اور وہ ذبح ولد تھی۔ یعنی اگر قربانی ڈھنگ سے کی جاوے تو وہ ذبح ولد کے قائم مقام ہے۔ دراصل —— "لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون" —— کی عملی شکل ہے یعنی نذرانہ دربارِ خداوندی کے طور پر اپنی پیاری سے پیاری چیز کو قربان کرنا جو سنت ابراہیمؑ کے مطابق بیٹےؑ کی جان ہے۔ کیونکہ ان کا اصل ارادہ بیٹے ہی کو قربان یا ذبح کرنا تھا۔ پھر اللہ تعالےٰ نے خود ہی بطور بیٹے کی جان کے فدیہ کے دُنبہ ان سے ذبح کرایا۔ اور جانور ذبح کرنا ہی سنت ابراہیمی کہلائی۔

اب قارئین اور مولانا ممدوح غور فرمائیں کہ مولانا کی بات صحیح ہے یا علمائے محققین کی جو احقر نے ظاہر کی ہے۔ دراصل حج کے سارے ہی افعال دیوانگی عشق کے مظہر ہیں اور جہاد کی عملی ٹریننگ سے قطعاً کوئی علاقہ نہیں رکھتے۔

۷ —— طواف و سعی کے متعلق مولانا نے فرمایا ہے۔

"پھر اپنے عقیدہ، اپنے ایمان، اپنے دین و مذہب کے اس مرکز کے گرد چکر لگاتا ہے......
پھر وہ صفا اور مروہ کے درمیان دوڑتا ہے گویا اپنی حالت سے اس کا ثبوت دے رہا ہے کہ یونہی اپنے مالک کی خدمت میں اور یونہی اس کی خوشنودی کی طلب میں ہمیشہ سعی کرتا رہے گا۔" ہم مولانا ممدوح سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کعبہ کی حیثیت یہی ہے کہ وہ اسلام کی عالمگیر تحریک کا مرکز اشاعت و تبلیغ ہے تو اس میں یہ تقدس کہاں سے پیدا ہو گیا کہ اس کا طواف کیا جائے۔ اس کی استانہ بوسی کی جائے یا اس سے لپٹ چمٹ کر دعا مانگنا اور رونا جائز بلکہ سنت انبیا ہو؟! کیا کسی تحریک کے مرکز کیساتھ کوئی ایسے افعال کرتا ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر آپ کعبہ کو صاف صاف بیت اللہ کہنے میں کیوں جھجکتے ہیں؟ بلا اس کو بیت اللہ مانے ہوتے آپ ان افعال کا کوئی عقلی جواز ہرگز پیش نہیں فرما سکتے۔ پھر افسوس ہی ہے کہ آپنے ترجمہ آیت اور واقعہ فیل کے علاوہ اپنے طویل بیان میں جو تاج کمپنی کی مطبوعہ "حقیقت حج" نامی کتاب کے ۱۹ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ کہیں بھی اس کو خدا کے رکھے ہوئے نام کیساتھ ذکر نہیں فرمایا۔ اسی طرح صفا اور مروہ کے درمیان سات مرتبہ چلنے کو بھی آپ نے مالک کی خدمت اور اس کی خوشنودی کی طلب میں سعی کرتے رہنے کے عزم کا مظہر قرار دیا۔ اگرچہ نہ حضورؐ کی بعثت سے قبل سعی کا یہ مطلب کبھی لیا گیا اور نہ حضورؐ نے اس مطلب کی طرف لوگوں کو کبھی توجہ دلائی۔ بلکہ تقریباً سارے ہی مسلمان اس فعل کو حضرت ہاجرہ علیہا السلام کی اس سعی کی یادگار سمجھتے ہیں جو انہوں نے حضرت اسمٰعیلؑ کو پیاس سے جاں بلب دیکھ کر پانی کی تلاش میں فرمائی تھی۔ نیز آپ نے جو صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنا بتایا ہے وہ بھی صحیح نہیں۔ صفا اور مروہ کا درمیانی فاصلہ تقریباً دو فرلانگ ہے اور جدید مسعیٰ بننے سے قبل جب کہ راستہ ہموار نہ تھا۔ یقیناً زیادہ تھا۔ پہاڑیوں پر چڑھنا اترنا پڑتا تھا۔ ایسی صورت میں دوڑ کر سات چکر لگانا اوسط درجہ کے آدمی کی طاقت سے باہر ہے۔ صحیح یہ ہے کہ صفا اور مروہ کے درمیان تھوڑے سے فاصلہ یعنی میلین اخضرین کے درمیان دوڑنا بی بی ہاجرہؓ کی سنت ہے اور حاجی لوگ بھی اسی کی یادگار میں صرف اتنے ہی فاصلہ میں دوڑتے ہیں۔ اسلام لانے کے بعد بعض لوگوں کو خیال ہوا تھا کہ زمانہ جاہلیت کا یہ فعل بعد میں ٹوٹکا نہ سمجھا جائے۔ اس پر اللہ تعالےٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ صفا اور مروہ شعائر اللہ میں سے ہیں ان کے درمیان سعی کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے یعنی اس فعل کو جاری رکھا جائے یہ ہے سعی کی حقیقت، نہ کہ وہ جو مولانا اسکو بنانا چاہتے ہیں۔

جی چاہتا تھا کہ مولانا کی ان جدتوں پہ مفصل تبصرہ کیا جاتا مگر جتنا بھی معمولی طریقہ پر کیا گیا اس سے بھی مضمون خاصا طویل ہو گیا ہے۔ پس اب صرف ایک اقتباس اور دیجیے اور اس پر مختصر سا کلام کر کے احقر اس باب کو بند کرتا ہے ——— ملاحظہ ہو ———

"پھر حرم کی سرزمین پر پہنچ کر قدم قدم پر انسان ان لوگوں کے آثار دیکھتا ہے جنہوں نے اللہ کی بندگی اور اطاعت میں اپنا سب کچھ قربان کیا۔ دنیا بھر سے لڑے، مصیبتیں اٹھائیں، جلاوطن ہوئے، ظلم پر ظلم سہے مگر بالآخر کلمۂ حق بلند کر کے چھوڑا۔ اور ہر اس باطل قوت کا سر نیچا کر کے ہی دم لیا جو انسان سے اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی کرانا چاہتی تھی۔ ان آیات بینات اور ان آثار متبرکہ کو دیکھ کر ایک خدا پرست آدمی عزم و ہمت اور جہاد فی سبیل اللہ کا جو سبق لے سکتا ہے۔ شاید کسی دوسری چیز سے نہیں لے سکتا۔ پھر طواف کعبہ سے اس کو مرکز دین کے ساتھ جو وابستگی ہوتی اور مناسک حج میں دوڑ دھوپ کوچ اور قیام سے مجاہدانہ زندگی کی جو مشق اسے کرائی جاتی ہے، اسے اگر نماز اور روزہ اور زکوٰۃ کے ساتھ ملا کر دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ یہ ساری چیزیں کسی بہت بڑے کام کی ٹریننگ ہیں جو اسلام مسلمانوں سے لینا چاہتا ہے۔ اسی لئے ہر مسلمان پر جو کعبہ تک جانے آنے کی قدرت رکھتا ہو۔ حج لازم کر دیا گیا ہے تاکہ جہاں تک ممکن ہو ہر زمانہ میں زیادہ سے زیادہ مسلمان ایسے موجود رہیں جو اس پوری ٹریننگ سے گزر چکے ہوں"

مولانا ممدوح کے اس تقریری زور بیان میں اگر واقعیت تلاش کریں تو معلوم ہو کر ———

۸ ——— حرم کی سرزمین میں خصوصی طور پر صرف حضرت ابراہیمؑ اور ان کی بیوی اور بچے کے آثار ہی، کعبہ، مقام ابراہیمؑ، چاہ زمزم اور صفا و مروہ کی شکل میں نمایاں ہیں جو سب ایک ہی جگہ ہیں قدم قدم پر نہیں ملتے۔ پھر بھی یہ پتہ نہیں چلا کہ انہوں نے کونسی باطل قوت کا جہاد کے ذریعے سر نیچا کیا تھا۔ سب سے بڑی باطل قوت نمرود کی سلطنت تھی، جس سے محض ہجرت حضرت ابراہیم نے فرمائی تھی جہاد کے ذریعے اس کو نظام حق سے بدلنے کی کوئی سعی ان سے ثابت نہیں۔ البتہ حضورؐ اور ان کے پاک صحابہ نے ضرور باطل کو سرنگوں کیا۔ مگر ان حضرات کے کوئی خاص آثار سوا ایک جبل رحمت کے یہاں آسانی سے

نہیں ملتے۔ جبل رحمت کو اکثر حاجی عرفات کے وقوف میں دور سے دیکھ لیتے ہیں، حضورؐ کے دو آثار غارِ حرا اور غارِ ثور بھی ہیں، مگر نہ وہاں جانا ضروری ہے نہ اکثر حاجی جاتے ہیں کیونکہ اول تو چڑھنا اترنا مشکل دوسرے بعض اوقات نمازِ حج میں سعودی حکومت اس کو بعض وجوہات سے ممنوع کر دیتی ہے، نیز ان حضرات کے حالات کتابوں میں اس سے زیادہ تفصیل کیساتھ بیان ہوئے ہیں جو حاجی وہاں جاکر مشاہدہ سے معلوم کر سکتا ہے۔ اگر ان آثارِ متبرکہ کو دیکھنے سے جہاد فی سبیل اللہ کا سبق ملا کرتا تو اکثر حاجی اس جذبہ سے بھرپور ہو کر مجاہدین بن جایا کرتے کیونکہ بقول مولانا حج جہاد کی ٹریننگ کو مکمل کرنیوالا ہے۔ مگر مشاہدہ قطعی اس کی تائید نہیں کرتا اور کعبہ کو محض ایک مرکزِ دین کی حیثیت دینے کی غلطی میں اوپر ظاہر کر چکا ہوں۔

۹ —— مولانا کا یہ فرمانا بھی صحیح نہیں کہ طوافِ کعبہ سے حاجی کو اس مرکزِ دین کے ساتھ وابستگی ہوتی ہے بلکہ حق یہ ہے کہ بیت اللہ کی حیثیت سے وابستگی تو کعبہ سے ہر مسلمان کو پہلے ہی سے ہوتی ہے۔ آخر مدت سے اس کی طرف منہ کرکے نماز پڑھتا ہی رہا ہے۔ یہاں پہنچ کر اس وابستگی کا عملی اظہار طواف، تقبیلِ حجرِ اسود اور ملتزم سے لپٹنے چمٹنے اور رو رو کر دعائیں مانگنے کی شکل میں کیا جاتا ہے نہ یہ کہ طواف کرنے سے وابستگی پیدا ہو۔

۱۰ —— مناسکِ حج کی دوڑ دھوپ سے مجاہدانہ زندگی کی مشق کا مفہوم لینا، ان کی اصل روح کو برباد کرنا ہے۔ رمی جمار، طواف اور سعی کی حقیقت پر کلام ہو چکا ہے۔ وقوفِ عرفات اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضری کے مترادف ہے۔ باقی وقوفِ مزدلفہ، نمازوں کو جمع کرنا۔ احرام اور اس کی پابندیاں حلق و قصر وغیرہ بہت سی چیزوں کی حکمت مجھے معلوم نہیں، دراصل افعالِ حج زیادہ تر ایسے ہی ہیں جن کی عقلی توجیہہ دشوار ہے۔ یوں اٹکل پچو باتیں کرنے سے کوئی فائدہ نہیں بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ اگر جہاد کی عملی ٹریننگ کے تکملہ کی نیت سے اگر کوئی حج کرے اس کا حج ادا نہ ہوگا۔ جیسے میں نے نماز کے بیان میں عرض کیا ہے کہ نماز کو جہاد کی ٹریننگ کی نیت سے ادا کرنے والے کے پیچھے نماز مکروہِ تحریمی ہے خدا ایسی تحقیق سے محفوظ رکھے جو حج کے ثواب کو ہی باطل کر دے اور سچ تو یہ ہے کہ حج میں فرزانگی کے بجائے دیوانگی کی ضرورت ہے، اور سارے افعالِ حج اسی عاشقانہ دیوانگی کیساتھ کما حقہ ادا ہو سکتے ہیں۔

وہ بڑا کام جس کا ارکانِ اربعہ بخیال مولانا ٹریننگ ہیں، جہاد ہے۔ جسکا تفصیلی ذکر انہوں نے خطبات کے بابِ جہاد میں کیا ہے۔ اس نظریہ کی حقیقت ظاہر کرنے کے لئے تو یہ مضمون لکھا ہی جا رہا ہے۔

قارئین کرام اس میں مولانا ممدوح کی ہر بات کا جواب انشاءاللہ پالیں گے۔ بشرطیکہ وہ صبر کیساتھ اس کو بغور پورا پورا پڑھنے اور احقر کے معروضات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کی زحمت فرمادیں، اور عصبیت، ذہنی غلامی بات کی پچ وغیرہ سے بالاتر ہوکر منصفانہ طور پر حق کے متلاشی ہوں۔

یہاں تک انفرادی حیثیت سے ارکان اربعہ کے جہاد کے ٹریننگ کورس کے طور پر وضع نہ کئے جانے کے دلائل آپ نے سُنے اب ہم ان کے بحیثیت مجموعی بھی ایسا نہ ہونے کے چند دلائل پیش کرتے ہیں

۱ ـــــــ کیونکہ جہاد بمعنی المعروف یعنی قتال عورتوں پر فرض نہیں ہے اور نہ ان کو اسلام کی اشاعت و تبلیغ کے لئے گھر سے نکلنے کا حکم ہے اس لئے ارکان اربعہ ان پر ہرگز فرض نہ کئے جاتے۔ یہ ارکان اربعہ کے جہاد کی ٹریننگ کی حیثیت سے فرض نہ کئے جانے کی کھلی اور مسکت دلیل ہے۔

۲ ـــــــ حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ کچھ صحابہ کرام حضورؐ کی خدمت میں کسی سریہ سے واپس آئے حضورؐ نے فرمایا کہ ـــــــ "تم لوگ بہت اچھا آنا آئے کہ جہادِ اصغر سے جہادِ اکبر کی طرف آئے" اس جہاد اکبر میں ارکانِ اربعہ میں احسان کا درجہ حاصل کرنا اور دوسری اصلاح نفس کی کوششیں ذکر اللہ وغیرہ داخل ہیں۔ پس جہاد اکبر، جہاد اصغر کا ٹریننگ نہیں ہو سکتا۔

۳ ـــــــ حدیث میں آیا ہے کہ قربِ قیامت میں جہاد دجال کے قتل کے بعد ختم ہو جائیگا اور ساری دنیا میں اسلام کے علاوہ کوئی دین نہ ہوگا۔ اس وقت جہاد کی ٹریننگ کو عقلاً ختم ہو جانا چاہیئے مگر ایسا نہ ہوگا بلکہ ارکانِ اربعہ زیادہ انہماک کے ساتھ ادا کئے جاویں گے۔ ظاہر ہے کہ وہ جہاد کا ٹریننگ نہیں بلکہ مقصود بالذات ہیں۔

۴ ـــــــ اگر ارکانِ اربعہ جہاد کا ٹریننگ کورس ہوتے تو ان کی پابندی میں اتنی سختی نہ کی جاتی۔ ہر ٹریننگ میں کچھ زمانہ آرام اور چھٹی کا ہوتا ہے، اس لئے یہ بھی کبھی موقوف ہو جاتے یا ان میں تخفیف کر دی جاتی مثلاً نماز بجائے فرض کے نفل کر دی جاتی۔ روزوں میں کچھ کمی کر دی جاتی۔

۵ ـــــــ اگر ان کی حیثیت ٹریننگ کی ہوتی، تو ان میں تلافی مافات یعنی قضا نماز، روزوں اور زکوٰۃ کو ادا کرنے کا حکم نہ ہوتا اور حج بدل کی وصیت ضروری نہ ہوتی۔ نہ نمازوں اور زکوٰۃ کی ادائیگی ترکہ سے کئے جانے کی وصیت جائز ہوتی۔ جو ٹریننگ ہمیشہ ایک ہی طریقہ پر چلتا رہے، اس میں کبھی بھی شرکت کی جاسکتی ہے تلافی مافات کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس سے ظاہر ہے کہ ارکانِ اربعہ کا ٹریننگ سے کوئی تعلق

نہیں بلکہ یہی اپنی ذات میں مستقل طریقہ سے مقصود ہیں۔

۶ ——— ارکان اربعہ فرض ہیں جب کہ جہاد جو نظام کفر کو مٹا کر نظام حق قائم کرنے کو کیا جائے بعض فرض کفایہ ہے پھر فرض عین فرض کفایہ کا مقدمہ اور اس کے تابع کیونکر ہو سکتا ہے۔

۷ ——— نماز روزہ اور زکوٰۃ تمام امم سابقہ پر فرض رہے ہیں اور بعض پر غالباً حضرت ابراہیمؑ کے بعد والی امتوں پر غالباً حج بھی فرض رہا ہے۔ اور یہ بھی ثابت رہا ہے کہ جہاد سب پر فرض نہیں رہا۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ ارکان اربعہ جہاد کے ٹریننگ کورس کی حیثیت سے ہرگز فرض نہیں کیے گئے۔ اگر کوئی کہے کہ جہاد بھی سب امتوں پر فرض رہا ہے تو وہ یہ بتلا دے کہ امت مسلمہ میں پھر کیا خصوصیت باقی رہ جائیگی جو سے اللہ تعالیٰ خیر الامم کے لقب سے ملقب فرمادیں۔ وجہ خیریت یہی تو ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر زیادہ انہماک سے انجام دیتی ہے اور اس میں آسانی پیدا کرنے کے لیے جہاد سے بھی کام لیتی ہے اس کے علاوہ خیر الامم ہونے کی کوئی اور وجہ ہو تو ہمیں بتلائی جائے۔

۸ ——— ہر کام کے لئے تربیت یافتہ شخص اصولاً غیر تربیت یافتہ سے بہتر ہونا چاہیے۔ اگر ارکان اربعہ جہاد کا ٹریننگ کورس ہوتے تو ان میں رسوخ رکھنے والے یقیناً غیر تربیت یافتوں یعنی ان کی پابندی نہ کرنے والوں یا کم کرنے والوں سے جہاد کے لئے بدرجہا بہتر ہوا کرتے۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے اعلیٰ تربیت یافتہ جہاد کے لئے سرے سے ناکارہ ہوتے ہیں۔ خود حضورؐ کے وقت کی ایسی مثالیں ہیں۔ کہ بعض لوگ عین قتال کے وقت ایمان لائے اور قتال میں شریک ہو کر اچھے مجاہد ثابت ہوئے۔ تو یہ کیسی ٹریننگ ہے جس کے بلا بھی مقصود عمدگی سے حاصل ہو سکتا ہے!

غالباً لکھنؤ کے ایک خانصاحب کا ذکر ہے کہ وہ نماز روزہ کے قریب نہ جاتے تھے اور جب کوئی ان کو ٹوکتا تو کہتے کہ بھائی جنت کے لئے اس قدر محنت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم تو دو ہاتھ ادھر چلائیں گے اور دو ادھر کھٹ سے جنت میں پہنچ جاویں گے۔ چنانچہ کفار کیساتھ مسلمانوں کی ایک لڑائی میں شریک ہوئے اور خوب دادِ شجاعت دیکر شہید ہو گئے جو جنتی ہوتا ہے۔

اگر مولانا ممدوح ان دلائل کے بارہ میں یہ فرمادیں کہ میں تو ان کو جہاد کا روحانی ٹریننگ کہتا ہوں کہ ان سے اللہ تعالیٰ کی محبت اور تعلق میں زیادتی ہوتی ہے جس کے بغیر سرفروشی کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا اگرچہ ان کی تحریر سے یہ خیال ہرگز ظاہر نہیں ہوتا۔ تاہم اس کا ایک جواب تو نمبر (۷) میں اوپر آچکا کہ یہ ان امتوں پر فرض نہ ہوتے

جن پر جہاد فرض نہ تھا ———— دوسرا جواب مولانا کے لئے قابل غور یہ ہے کہ کیا محبت اور تعلق مع اللہ کی عبدیت کی غرض سے ضرورت نہیں؟ پس ان ارکان کو آپ جہاد میں معین تو بے شک کہہ سکتے ہیں مگر ان کا جہاد کی غرض سے فرض کئے جانے کا خیال قطعی غلط اور بے بنیاد ہے یہ محض مولانا کی ذہنی اپج ہے۔ میں اس سلسلہ میں یہ بھی عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ نظریہ غیر مسلم حکومتوں میں رہنے والے مسلمانوں کے لئے سخت مضر بھی ہے کیونکہ خدانخواستہ اگر ان حکومتوں کو ہمارے ہی بیان سے یہ معلوم ہو جائے کہ ارکان اربعہ عبادت خالصہ مخلصہ نہیں بلکہ جہاد کا ٹریننگ کورس ہیں، یعنی یہ نماز نہیں بلکہ پریڈ ہے۔ روزہ نہیں بلکہ لڑائی میں بھوکا، پیاسا رہنے اور بے وقت کھانے کی مشق ہے، نہ زکوٰۃ خیرات نہیں بلکہ جنگی فنڈ میں امداد ہے، حج نہیں بلکہ جہاد کے منصوبے بنانے کی ایک عالمی اسلامی کانفرنس ہے، رمی جمار رغماً للشیطان نہیں بلکہ چاند ماری کی مشق ہے تو یقیناً وہ حکومتیں ان اعمال پر پابندی لگا دینے میں حق بجانب ہوں گی۔ اور مسلمان خود اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنے والے کے مصداق ہوں گے۔ خدا ایسی ذہانت اور اس کے مہلک نتائج سے مسلمانوں کو محفوظ رکھے، بڑے آدمیوں کی نقالی میں آجکل جہلاء بھی احکام شرعیہ کی علتیں تلاش کرتے اور خود گھڑ کر بتلانے کی بُری عادت میں مبتلا ہو گئے۔

اخبار نشیمن (بنگلور۔ ہند) میں اس قسم کی خرافات میری نظر سے گزری ہیں۔ ایک بار کسی کا لجاہل نام کے مولوی کی بیان کردہ نماز کی حکمت اس میں، میں نے پڑھی تھی کہ اللہ تعالےٰ ہماری عبادت کی احتیاج نہیں رکھتا۔ یہ سب ہمارے ہی فائدے کے لئے ہے، چنانچہ ارکانِ اربعہ کی حکمت اتحاد و اتفاق ہے۔ نماز بھی اتحاد کا بڑا ذریعہ ہے۔ جس کے انہوں نے چند خود ساختہ دلائل دیئے تھے۔ ایسے احمقوں سے کوئی پوچھے کہ کیا اتحاد پیدا کرنے کی یہی صورت ہے کہ اندھیرے اجالے سردی گرمی میں گھر سے چل کر مسجد تک آؤ۔ بعض اوقات ناگوار حد تک سرد پانی سے وضو کرو، پھر نماز میں مسجد کی گرد بھری چٹائیوں پر اپنے صاف شفاف کپڑے میلے کرو۔ جب اتحاد ہی مقصود ہے تو کیا دوسرے طریقوں سے ممکن نہیں ہے جن میں یہ دقتیں نہ ہوں، مثلاً بڑے آدمی کلب (CLUB) میں جاکر آرام کیساتھ اتحاد و اتفاق پیدا کر سکتے ہیں اور غرباء کے لئے بھی دوسری صورتیں ممکن ہیں۔ غرض احکام الٰہیہ کی حکمتیں تلاش کرنا عمارت دین کو منہدم کرنا ہے جس کی کئی وجوہات ہیں اُن سب کے بیان کا تو یہاں موقعہ نہیں صرف دو پر اکتفا کی جاتی ہے۔ ایک تو یہی جو بیان ہوئی کہ کسی حکم کی کوئی حکمت اور علت تلاش کرکے مقصود کو دوسرے ذریعہ سے حاصل کر لینا کافی سمجھنا

دوسری یہ ہے کہ ——— حکمتیں منصوص تو بہت کم ہیں صرف ظن وتخمین پر مبنی ہیں۔ اگر تم نے کوئی حکمت تلاش کی اور کسی ذہین مخاطب نے اس میں کوئی ایسا خدشہ نکال دیا جس کا جواب تم سے نہ بن پڑا تو تم خود بھی اس کو بے وقعت سمجھنے لگو گے۔ لہٰذا احکام شرعیہ کی حکمتیں تلاش کرنا اور دوسروں کو بتلانا ایک مہلک غلطی ہے۔

اب میں قرآن مجید کی ایک آیت کا ترجمہ پیش کر کے اس بحث کو ختم کرتا ہوں ———
آیت ۴۱ سورۂ حج میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ———

"اگر ہم ان (مسلمانوں) کو دنیا میں حکومت دیدیں تو یہ لوگ (خود بھی) نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں اور (دوسروں کو بھی) نیک کاموں کو کرنے کو کہیں اور بڑے کاموں سے منع کریں"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ارکان اربعہ جہاد کے لئے وضع نہیں ہوئے بلکہ جہاد ہی ان کی بلا مزاحمت ادائیگی اور تبلیغ کے لئے شروع ہوا ہے۔

بحمد اللہ ——— مولانا کے ایک نظریہ پر ہر پہلو سے غور کر لیا گیا اب دوسرے نظریہ پر غور کرتے ہیں

(۲)

کیا جہاد نظامِ حق کی سعی ہی کا دُوسرا نام ہے؟

ہمارے نزدیک جہاد نظام حق کی سعی ہی کا دوسرا نام نہیں بلکہ نظام حق کی سعی کا نام بھی ہے کیونکہ حدیث میں جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ اصلاح نفس کی کوشش یا اعمال شرعیہ کی پوری پوری پابندی کو جہاد افضل کہا گیا ہے۔ نماز کو جہاد افضل فرمایا گیا ہے ——— اور ایک دوسری حدیث میں جابر حاکم یا بادشاہ کے روبرو حق بات بلا خوف کہنے کو بھی افضل جہاد فرمایا گیا ہے۔ اس لئے جہاد کو صرف نظام حق کی سعی میں منحصر سمجھ لینا اس کے مفہوم کو تنگ کرنا ہے۔ قرآن میں منافقین سے جہاد کرنے کا حضورؐ کو حکم ہوا ہے۔ اگرچہ وہ نظامِ حق کے اندر ہی رہتے تھے اور یہ بھی معلوم ہے کہ ان سے قتال کبھی نہیں کیا گیا۔ پس اس حکم میں جہاد باللسان مراد ہے یہ بھی جہاد ہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں منکرین زکوٰۃ سے بھی جہاد کا ارادہ فرمایا،

اگرچہ وہ بھی نظامِ حق کی رعایا تھے۔ غرض جہاد نظامِ حق کے قیام کے لئے ہی نہیں بلکہ اس کی بہت سی شکلیں ہیں اور راحقر کے خیال سے جہاد کی جامع تعریف یہ ہے کہ

"اعلاء کلمۃ الحق کی راہ میں پیش آنے والی مزاحمتوں کے دور کرنے میں حتی المقدور سعی کرنا جہاد ہے۔"

اور اعلاء کلمۃ الحق کے زمرہ میں بہت سے کام آسکتے ہیں مثلاً

۱ ـــــ نفس کو اس کے مرغوبات سے ہٹا کر اعمال شرعیہ کا پابند بنانا۔ تعمیر الظاہر والباطن، جو تصوف کہلاتا ہے اسی کا جزو ہے۔

۲ ـــــ اگر کسی بات میں مسلم اور غیر مسلم میں نزاع ہو تو حق جدھر بھی ہو اسی کا ساتھ دینا۔ اس میں مسلم غیر مسلم اور اپنے پرائے کا امتیاز نہ کرنا۔

۳ ـــــ مذاہب عالم پر اسلام کی برتری ٹھوس دلائل سے ثابت کرتے ہوئے غیر مسلموں کو دعوتِ اسلام دینا اور اگر مناظرہ کی ضرورت پڑے تو احسن طریقہ سے مناظرہ کے لئے تیار رہنا۔ یاد رہے کہ میرا مطلب محض اصول کی دعوت سے ہے نہ کہ فروع کی۔ یعنی صرف توحید و رسالت منوانے کے لئے۔

۴ ـــــ اپنے زیرِ اثر لوگوں کو خطاب خاص سے صالح بنانے کی پیہم سعی کرنا اور ان کے اعمال کا محاسبہ کرتے رہنا۔ اور اگر اہلیت ہو تو خطاب عام سے بھی لوگوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا۔

۵ ـــــ تحریر و تقریر سے بھی اہلیت کی صورت میں، مدافعتِ اسلام کرنا۔ یعنی غیر مسلموں نے جو جو اعتراضات اسلام پر کئے ہیں یا کرتے رہتے ہیں ان کا مدلل جواب شستہ اور مہذب طریقہ سے دینا اور ایسی کتابوں کا معترضین کی زبان اور دیگر زبانوں میں ترجمہ کرا کر ان کو کم قیمت اور کثیر الاشاعت کرنا۔

۶ ـــــ نمبران ۳، ۵ کی بہتر بجاآوری کے لئے قرآن کے حکم ـــــ ولتکن منکم امۃ الخ ـــــ کے مطابق ایک ایسی جماعت تیار کرنا جو بلحاظ علم قوت تقریر و مناظرہ، دیگر مذاہب کا بقدر ضرورت علم رکھنے اور دوسری زبانیں بولنے اور

سمجھنے پر قادر ہونے کی ضروری تربیت کے بعد اس کام کی ہر طرح اہل بنائی جائے اور اس کو فکرِ معاش سے فارغ کر کے داخلی اور خارجی تبلیغ پر برابر لگائے رکھنا۔

۷ ـــــ موجودہ، اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے ماحول اور وہاں کی تعلیم کو ایسا بنانا کہ وہاں کے فارغ التحصیل لوگ ملحد اور بے دین ہو کر نہ نکلیں اس کے لئے موزوں اساتذہ اور حسبِ ضرورت ترمیم شدہ کتابوں کی تصنیف کا انتظام کرنا ـــــ ظاہر ہے کہ اساتذہ بے دین ہوں اور کتابیں مذہب سے ہم آہنگ نہ ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ اکثر طلبا میں ضعف فی العقیدہ والعمل پیدا نہ ہو۔

۸ ـــــ دینی مدرسوں کے نصاب میں ابتدائی سائنس کی عملی و تجرباتی اور متوسط اور اعلیٰ سائنس کی محض اصولی اور نظری تعلیم داخل کرنا تاکہ دستار بند مولوی بدیہیات کے خلاف باتیں نہ کریں نیز آجکل کے ماحول میں تبلیغِ اسلام کے لئے زیادہ اہل ثابت ہوں۔

۹ ـــــ مسلمانوں کو منکرات سے نفرت دلانا اور تنعم پرستی اور کاہلی کے بجائے سادگی اور جفاکشی کی رغبت پیدا کرنا ہے۔

اعلاءِ کلمۃ الحق کے مندرجہ بالا یا انہیں کی مثل اصناف میں قتال کی ضرورت نہ ہوگی۔ لیکن اعلاءِ کلمۃ الحق کی دوسری قسم اسلام کی مدافعت اور حفاظت خود اختیاری بھی ہے۔ جس کے لئے قتال کی ضرورت پڑ سکتی ہے اور جہاد بمعنیٰ المعروف قتال ہی کا مفہوم رکھتا ہے ـــــ اس معروف جہاد کے متعلق مولانا تھانوی صاحب فرماتے ہیں کہ ـــــ

"جہاد اسلام کی مدافعت اور حفاظتِ خود اختیاری کے لئے ہے۔ اسلام پھیلانے کے لئے نہیں۔ اگر اسلام پھیلانے کے لئے جہاد ہوتا تو جزیہ مشروع نہ ہوتا ـــــ ایک مولوی صاحب نے مجھ سے دریافت کیا تھا کہ جہاد کی غرض کیا ہے، اور اس کے بعد ـــــ لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ ـــــ سے اشکال پیش کرنے والے تھے۔ میں نے کہا جہاد اسلام پھیلانے کے لئے نہیں اسلام کے غلبہ (سیاسی) کے لئے ہے۔ کیونکہ ہمیں تبلیغ کا حق ہے اور یہ حق دوسروں کے غلبہ کی حالت میں اطمینان کیساتھ استعمال نہیں ہو سکتا۔ جب چاہیں اس کو روک سکتے ہیں۔

کہنے لگے کہ یہ غرض تو صلح سے بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ میں نے کہا کہ صلح میں مساوات ہوتی ہے۔ جب چاہیں امن اور صلح کو برباد کر دیں اور توڑ دیں۔ غلبہ کی حالت میں یہ نہیں ہو سکتا۔ خلاصہ یہ کہ جہاد سے مقصود اسلام کا یہ ہے کہ عالم سے فتنہ فرو ہو جائے ——— حتی لا تکون فتنۃ و یکون الدین کلہ للہ ——— میں اس کی تصریح ہے اور فتنہ کا فرو ہونا موقوف ہے اسلام کے غلبہ پر اور غلبہ موقوف ہے۔ جہاد یا خوفِ جہاد پر۔ پھر اس غلبہ کے بعد دیکھنے کی بات یہ ہے اور تواریخ اس پر شاہد ہیں کہ اور قومیں ایسے غلبہ کے بعد کیا کرتی ہیں اور اسلام کیا کرتا ہے، یہ واقعہ ہے کہ کفار کو خود اپنی سلطنت اور حکومت میں وہ چین اور راحت نصیب نہ تھی جو اسلام کے ماتحت رہ کر نصیب ہوئی اور جو برتاؤ وہ اپنی حکومت میں رعایا کیساتھ کرتے ہیں اسلام میں ان کے ساتھ اس سے بہتر برتاؤ کیا جاتا ہے۔ اس کے لئے احکام و مسائل اسلام دیکھو تو معلوم ہوگا کہ دوسری غیر مسلم اقوام اسلام کی سی رعایتیں پیش نہیں کر سکتیں .... اور یہ جو اوپر کہا گیا ہے کہ جہاد مدافعت اور حفاظتِ خود اختیاری کے لئے ہے اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ جہاد میں ابتداء نہ کی جاوے، خود ابتداء کرنے کی غرض بھی یہی مدافعت و حفاظت ہے۔ کیونکہ بدون غلبہ کے احتمال ہے مزاحمت کا۔ اسی مزاحمت کے انسداد کے لئے اس کا حکم کیا جاتا ہے ——— خلاصہ یہ ہے کہ جو مدافعت غایت ہے جہاد کی وہ عام ہے مزاحمتِ واقعہ فی الحال کی مدافعت کو اور مزاحمت متوقعہ فی الاستقبال کی مدافعت کو؟

(اقتباس از ملفوظ ۴۹۰ الافاضات الیومیہ جلد ششم)

پس قتال فی سبیل اللہ کے دو موقعے ہیں۔ ایک تو وہ جب کفار اہل اسلام پر حملہ آور ہوں، یعنی مزاحمت فی الحال کی مدافعت کے لئے دوسرا موقعہ خود جہاد کی ابتداء کا ہے۔ اس غرض سے کہ تبلیغِ اسلام اطمینان سے ہو سکے۔ ——— پہلی صورت میں جہاد کو فقہاء نے فرضِ عین قرار دیا ہے اور دوسری صورت میں فرضِ کفایہ۔ لیکن اگر کسی غیر مسلم حکومت میں مسلمان اقلیت میں ہوں، مظلوم ہوں، کہیں ہجرت بھی نہ کر سکتے ہوں نہ اپنے دین پر آسانی سے عمل کر سکتے ہوں۔ ایسی

حکومتوں کے خلاف مسلم حکومتوں کا جہاد کرنا بھی احقر کے خیال میں پہلی ہی صورت میں داخل ہے یعنی فرض عین ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ مولانا مودودی والا جہاد جو محض نظامِ حق کی سعی ہی کا دوسرا نام ہے ہمارے زمانے میں فرض کفایہ بھی ہے یا نہیں ؛ بڑی غرض اس قسم کے جہاد کی بروئے قرآن جیسا کہ آیت ۴۱ سورۂ حج کے حوالے سے اوپر بیان ہوئی تبلیغ میں سہولت ہے۔ یعنی تبلیغ کے راستے میں مزاحمت کو دور کرنا احقر کے خیال سے یہ مزاحمت ہی بڑا فتنہ ہے۔ گو اپنے جامع مفہوم میں فتنہ ہر اس چیز کا نام ہے جو اسلام کی بقا اور تبلیغ اور امن عامہ میں مزاحم ہو۔ اور حضرت تھانوی صاحب کے مطابق اس کا فرد ہونا موقوف ہے اسلام کے غلبہ پر اور غلبہ موقوف ہے جہاد پر یا خوف جہاد پر۔

خوفِ جہاد کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی حکومت اتنی مضبوط اور طاقت ور ہو کہ فتنہ سر ہی نہ اٹھا سکے۔ یعنی غیر اسلامی حکومتوں کی یہ ہمت ہی نہ ہو کہ وہ اسلامی حکومت کے خلاف کوئی جارحانہ یہ مخالفانہ اقدام کریں۔ یا اس کی تبلیغ کو اپنے ہاں روکیں۔ ایسی حالت میں تو قیامِ نظامِ حق کے لئے جہاد کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ صرفِ خوفِ جہاد ہی اس کا بدل کافی ہے۔ اور اگر اسلامی حکومت اپنی بعض کمزوریوں کی وجہ سے جہاد کی صلاحیت ہی نہ رکھتی ہو۔ جیسا کہ آجکل ہے۔ تو بدرجہ اولیٰ اس پر اس قسم کے جہاد کا وجوب ساقط ہے۔

احقر اس خیال سے قطعی متفق نہیں کہ ——————

" دنیا کی ہر غیر مسلم حکومت کو ختم کر کے اس کی جگہ اسلامی حکومت قائم کرنے کے لئے جہاد کرتے رہنا مسلمانوں کا فرض ہے قرآن میں اس قسم کا کوئی حکم نہیں ہے "

امت مسلمہ کو قرآن میں خیر الامم کہا گیا ہے وہاں ساتھ ہی وجہ خیریت بھی بیان فرمادی ہے کہ اس کی وجۂ تخلیق ہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے اور مفسرین نے اس کی تشریح میں یہ بھی فرمایا ہے کہ یہ مقصد تبلیغ یعنی اس میں مزاحمت کو رفع کرنے کے لئے قتال بھی کر سکتی ہے اور نظامِ تبلیغ کا پورا طریقہ بھی اللہ تعالےٰ نے خود ہی بتلا دیا۔ یعنی —————— انذر عشیرتک الاقربین — جیسی آیتوں کے ذریعے تو اپنے زیرِ اثر لوگوں پہ تبلیغ بخطابِ خاص کو ہر شخص پر فرض کر کے اور

—— ولتکن منکم امۃ الخ —— میں تبلیغ بخطاب عام لوگوں کے لئے اہل لوگوں کی ایک جماعت تیار کرنے اور اس کو اسی کام کے لئے فارغ رکھنے کا حکم دیکر۔ غرض خیر الامم ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ یہ امت بہترین منظم طریق پر کار تبلیغ دنیا بھر میں حسب استطاعت انجام دیگی اور ضرورت پڑنے پر اگر حالات موافق ہوئے تو تبلیغ کی راہ میں پیش آنے والی مزاحمتوں کو قتال کے ذریعے بھی دور کرے گی۔ —— نہ یہ کہ نظام نائے کفر کو نظام اسلامی سے بدلنے کے لئے ہر وقت تلوار کو بے نیام رکھے گی۔ غرض خیر الامم ہونے کا یہ تقاضا تو نہیں ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ مسلمانوں کا انفرادی اور اجتماعی کردار ایسا مثالی اور پرکشش ہو کہ دنیا کی دوسری قومیں اس سے سبق لیں —— واللہ اگر مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان ہوتے تو خواہ وہ اسلام کی تبلیغ نہ بھی کرتے تاہم ان کو دیکھ دیکھ کر لوگ ایمان لایا کرتے۔ دیکھئے وہ تاتاری قوم جس نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور مسلمانوں کا بے دریغ خون بہا کر زائد از پانچ سو سال کی اسلامی حکومت یعنی خلافت بنو عباسیہ کا خاتمہ کردیا۔ وہ خود کسی مسلمان بزرگ کے کردار سے متاثر ہو کر ساری کی ساری مسلمان ہوگئی۔ —— بقول علامہ اقبالؒ ؎

عیاں ہے شورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

دورِ نبوی یا دورِ خلافتِ راشدہ کے جہادوں سے استدلال درست نہیں۔ اس وقت اس کی ضرورت تھی۔ اگر حضورؐ کفار سے قتال کر کے ان کو مغلوب نہ کرتے تو وہ اسلام کو ہرگز نہ پنپنے دیتے اور جزیرہ نما عرب میں بھی اس کے قدم نہ جم پاتے۔ نیز اگر حضورؐ عرب میں حکومت عادلانہ قائم نہ فرماتے تو دین کے باب سیاست اور انتظام ملکی کی عملی تعلیم نہ ہو پاتی اور یہ دین کامل نہ ہوتا۔

اسی طرح اگر خلفاء راشدین قرب وجوار کی اسلام دشمن حکومتوں پر جہاد نہ کرتے تو وہ بھی چونکہ اس نوزائیدہ حکومت اور اپنے خیال سے نئے دین کو مخالفانہ انداز میں دیکھ رہی تھیں اور اس زمانہ کے عام مذہبی تعصب کے باعث اپنے ہاں اس کی تبلیغ کی اجازت نہیں دے سکتی تھیں۔ اس لئے ان سے ہر وقت خطرہ تھا۔ جس کا سدباب مزاحمت متوقعہ کی مداخلت کے طور

پر بلا غلبہ کئے ممکن نہ تھا۔ جو جہاد کے ذریعے حاصل کیا گیا۔ ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی مدنظر رکھا جائے کہ پہلے زمانہ میں کیا۔ اب سے تقریباً ایک صدی پیشتر تک بھی دنیا میں ممالک فتح کرنے کا عام رواج تھا جو بادشاہ بھی طاقت در ہوتا وہ دوسروں کو باجگذار بنانے اور اپنے طاقت کا سکہ بٹھانے کو بلا تکلف ممالک فتح کر کے اپنی سلطنت کو وسیع سے وسیع تر کرتا چلا جاتا تھا۔

جو لوگ آج اسلام پر اعتراض کرتے ہیں مثلاً انگریز انہوں نے خود اسی طریقے سے اپنی سلطنت کو اتنا وسیع کر لیا تھا کہ اس میں سورج غروب نہ ہوتا تھا۔ غرض یہ چیز بادشاہوں کے محاسن میں شمار ہوتی تھی، چہ جائیکہ بُری نظر سے دیکھی جاتی، ——— ہندوستان میں پرانے زمانے میں طاقت ور راجہ اشومیدھ یگیہ کرتا تھا۔ خود راجہ رامچندر جی کو ہندو خدا کا اوتار مانتے ہیں نے بھی ایسا یگیہ کیا ——— ان حالات میں مسلمانوں کا تسخیر ممالک جو بہر حال ایک نیک مقصد کے لئے تھا۔ کسی منصف مزاج شخص کے نزدیک ہرگز قابل اعتراض نہیں ہو سکتا۔ جب کہ یہ بخوبی ثابت ہے کہ کسی کو اسلام لانے پر ذرا بھی مجبور نہیں کیا گیا۔

پس یہ تو صحیح ہے کہ مسلمانوں نے تلوار کے زور سے ممالک فتح کئے۔ مگر تلوار کے زور سے اپنے قوانین کی رو سے نہ وہ اسلام پھیلا سکتے تھے اور نہ اسلام اس طرح پھیلا۔ یہ عدم اشاعت اسلام بزور بیعت کا ذکر بطور جملہ معترضہ کے بیان ہو گیا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ اسلام کے ابتدائی دور میں غلبہ کے لئے جہاد کی ضرورت تھی مگر اب دنیا کے سیاسی حالات بہت بدل گئے ہیں نیز مذاہب کی اہمیت بھی غیر مسلموں کی نظر میں کوئی خاص نہیں رہ گئی ہے اس لئے تبلیغ اسلام کو اکثر غیر اسلامی حکومتیں اپنے یہاں منع نہیں کرتیں۔ مولانا الیاسؒ کی تبلیغی جماعت کمیونسٹ ممالک کے علاوہ دنیا بھر میں اپنا دائرہ عمل پھیلاتی جا رہی ہے ——— نیز آجکل توسیع پسندی کو بہت بُرا سمجھا جاتا ہے۔

یوں بھی اسلام ربع مسکوں کے تقریباً ۱/۸ حصہ پر پھیل چکا ہے اس کی جڑ جم چکی ہے اور دنیا نے اسلام کو ایک مشہور و معروف مذہب کی حیثیت سے تسلیم (RECOGNISE) کر لیا ہے۔ ان حالات میں تبلیغ کے لئے صلح کو ناکافی سمجھ کر یا محض نظام کفر کو نظام حق سے بدلنے کے لئے جہاد کرنا بخیال احقر علی الاطلاق فرض کفایہ کا درجہ نہیں رکھتا۔ فرض کفایہ سے بہر حال ایک فرض کا

تارک ہونا متبادر ہوتا ہے۔

اول تو آجکل ایسے جہاد کی باتیں کرنا ہی اس مثل کے مصداق ہے کہ گھر میں سوت نہ کپاس جلاہے سے ٹھینگم ٹھینگا۔ جہاد کی اولین شرط معتدبہ قوت اور ایک متفق علیہ امیر کی موجودگی ہے اور یہاں خیر سے دونوں ہی چیزیں مفقود ہیں اور بظاہر فی الحال یا مستقبل قریب میں کوئی امید بھی ان کے وجود کی نظر نہیں آتی ——— بلکہ میں تو ترقی کر کے کہتا ہوں کہ اگر بفرض محال مسلمانوں میں قوت اور متفق علیہ امیر بھی ہو تب بھی دنیا کے بدلے ہوئے سیاسی حالات میں نظام حق کی سعی غیر مسلم حکومتوں میں کرنا علی الاطلاق فرض کفایہ نہیں ہے۔ کیونکہ اگر آجکل مسلمان اس غرض سے کسی ملک پر جہاد کریں تو دنیا بھر کی حکومتیں ان کو برا کہیں گی۔ ان کے خلاف صف آرا ہوں گی عالمگیر جنگ چھڑ کر امن عالم تباہ ہوگا اور فتنہ بجائے فرو ہونے کے اور بڑھے گا۔ ہاں اگر مسلمانوں میں اتنی قوت ہو جائے کہ وہ بیک وقت دنیا بھر کی غیر مسلم طاقتوں سے لوہا منوا سکیں تو بے شک انہیں نظام حق کے قیام کے لئے جہاد کا حق ہوسکتا ہے۔ ——— مگر ایسی قوت کا حصول ظہور مہدی علیہ السلام اور نزول عیسیٰ علیہ السلام سے قبل متصور نہیں۔ پس نظام حق کی سعی کو علی الاطلاق فرض کفایہ کہتے رہنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

علماء کرام براہ کرم اس چیز پر غور فرمائیں۔ قرآن کی رو سے بھی اس کی اہمیت مدت سے ختم ہو چکی ہے ——— دیکھئے آیت نمبر ۱۰ سورہ حدید میں ہے کہ ———

"جو لوگ فتح مکہ سے پہلے (اللہ کی راہ میں) خرچ کر چکے اور لڑ چکے وہ درجہ میں ان لوگوں کے برابر نہیں بلکہ ان سے بڑے ہیں۔ جنہوں نے بعد میں خرچ کیا اور لڑے۔"

اس سے یہ اشارہ بآسانی نکلتا ہے کہ جو لوگ جزیرہ نمائے عرب پر اسلامی حکومت کے قیام کے بعد لڑے اور خرچ کیا۔ ان کا درجہ ان سے بھی کم ہے جو اس سے قبل لڑے۔ غرض جوں جوں اسلامی مملکت وسیع ہوتی گئی۔ نظام حق کی سعی کا درجہ گھٹتا چلا گیا۔ پھر جب پورا مشرق وسطیٰ اور دیگر ممالک کو ساتھ ملا کر ربع مسکوں کے ½ حصہ سے زائد پر مسلمان قابض ہو گئے تو اس قسم کے جہاد کی جو اہمیت رہ گئی ہو۔ اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں خصوصاً جب کہ غیر مسلم حکومتوں میں تبلیغ کی رکاوٹیں بھی بڑی حد تک ختم ہو چکی ہوں۔

البتہ مسلم حکومتوں کا اسلامی حکومتیں نہ ہونے کا کوئی جواز نہیں۔ جب وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں تو اپنی حکومتوں کو اسلامی کیوں نہیں بناتے! نظام حق کے قیام کی ہر ممکن پرامن کوشش کرنا وہاں کے باشندوں پر فرض ہے، اور احقر کے خیال سے یہ کوشش سوائے ایک موثر تبلیغ کے ذریعہ عوام کے اذہان کو بدلنے اور انہیں صحیح معنوں میں مسلم بنانے کے سوا کچھ نہیں۔ وہاں یہی جہاد ہے۔ جب بڑی اکثریت کا فکر اسلامی ہو جائے گا۔ تو حکومت کو بھی اسلامی ہوتے دیر نہ لگے گی۔ بلا اذہان کو بدلے اسلامی حکومت قائم کرنا زیادہ مفید بھی نہیں ہو سکتا۔ اور بقول ڈاکٹر اسرار احمد صاحب (سابق رکن جماعت اسلامی پاکستان) مدیر "میثاق" نظام اسلامی کے قیام کے لئے ایک سیاسی جماعت بنانا تو ہرگز نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا۔

خلاصہ اس تمام بحث کا دو اہم باتیں ہیں اور احقر کے خیال سے ان میں مسلمانوں کی تمام موجودہ دینی اور دنیوی پستی اور زبوں حالی کا علاج بھی مضمر ہے۔

اول یہ کہ ——— آجکل محض نظام حق کے قیام کے لئے قتال کے ذریعے غلبہ کرنا نہ ضروری ہے اور نہ مناسب۔ بلکہ اس کو تو فرض کفایہ کی فہرست ہی سے نکال دینا چاہیئے۔ البتہ دوسری وجوہات کی بنا پر مثلاً تبلیغ اسلام پر سے پابندی ہٹوانے کے لئے یا مسلمانوں کو غیر مسلم حکومتوں میں پوری مذہبی آزادی دلانے کے لئے یا ان پر مظالم کے انسداد کے لئے جہاد کا جواز اس وقت ضرور ہے جب کہ گفت و شنید کے ذریعے کسی طرح کامیابی نہ ہو۔ کہیں فرض عین کے طور پر اور کہیں فرض کفایہ کی حیثیت سے مگر وجوب کے لئے استطاعت وغیرہ کو مدنظر رکھنا پڑے گا۔

غلبہ کی بہتر صورت آجکل جہاد کے بجائے اُسے "خوفِ جہاد" کے ذریعے حاصل کرنا ہے۔ یعنی حکومتیں متحد ہو کر اتنی فوجی قوت پیدا کریں کہ غیر مسلم حکومتیں نہ تو اپنے یہاں تبلیغ اسلام کی مانعت کرنے کی ہمت کریں۔ جیسا کمیونسٹ حکومتیں کر رہی ہیں اور نہ مسلمانوں کو اپنے مذہبی فرائض کی آزادانہ بجا آوری سے جیسے برما کی حکومت مسلمانوں کو حج کی اجازت محض زرمبادلہ کی بنا پر نہیں دیتی اور نہ ہی اپنی مسلم رعایا پر کسی قسم کا ظلم کر سکیں ——— کفار کو مرعوب رکھنے کے لئے معتدبہ قوت مرہبہ بنائے رکھنا قرآن کا حکم بھی ہے اور اس مقصد میں جو چیز بھی معین ہو مثلاً سائنس اور ٹیکنالوجی میں اعلیٰ درجہ کی مہارت پیدا کرنا۔ حفظانِ صحت کے اصولوں کے مطابق

سادہ زندگی بسر کرنا۔ ورزش وغیرہ کے ذریعے ہر مسلمان کا اپنی قوت جسمانی کو بڑھانا اور برقرار رکھنا وغیرہ سب دین ہی میں شمار ہوگا۔ حدیث میں ہے کہ مومن قوی اللہ تعالیٰ کو مومن ضعیف سے زیادہ پیارا ہے مگر شاید ہی کچھ مسلمان ایسے نکلیں گے جو اللہ کا پیارا بننے کے لئے مومن قوی بننے کی ممکن تدبیروں کو اختیار کریں۔ قرآن کریم نے حضرت طالوتؑ کی اہمیت لازمت صرف دو لفظوں میں بیان فرمائی —— العلم والجسم —— کیا اس سے یہ سبق نہیں ملتا کہ مسلمانوں کو علم کے ساتھ ساتھ جسم کو بھی حتی الامکان درست اور قوی رکھنے کی سعی پیہم کی ضرورت ہے۔

مسلمان سامان عیش و تنعم کی فراہمی میں تو انگریزوں کی نقالی کرتے ہیں۔ جن کی مثالی اسلام اجازت بھی نہیں دیتا۔ مگر قوت مرہبہ کے حصول کی انفرادی اور اجتماعی کوششوں میں جو ان پر واجب بھی ہیں ان سے کوئی سبق نہیں لیتے۔ ہم نے کوئی انگریز ایسا نہیں دیکھا جس کی توند نکلی ہوئی ہو۔ جب کہ مسلمانوں میں ورزش نہ کرنے کی وجہ سے بہت سے لوگ اس مرض میں مبتلا ہیں۔ پس پہلی اہم چیز تو قوت مرہبہ کا حصول اس حد تک جو "خوفِ جہاد" کے ذریعے غلبہ کا باعث بنے اور دوسری اہم چیز تبلیغ کے داخلی اور خارجی نظام کو قرآنی منشار کے مطابق وسیع، موثر اور فعال بنانا ہے جس کا طریقہ اوپر عرض کیا جاچکا ہے —— یہ دونوں چیزیں مسلمانوں کی جملہ دنیوی اور دینی فلاح کی ضامن ہیں۔ مسلمانوں کو یہ اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ اپنے آپ کو صحیح معنوں میں مسلمان بنانے اور قائم رکھنے کی فکر بہر حال ان کی تعداد میں اضافہ کرنے کی کوشش سے کہیں زیادہ اہم اور غلبہ اسلام بذریعہ جہاد کی بات سوچنے سے کہیں زیادہ مقدم ہے۔ —— غیر مسلموں کو تبلیغ اسلام بھی اپنا جتھا بڑھانے کے لئے نہیں بلکہ ان کو دوزخ سے بچانے کی نیت سے خدا کا حکم سمجھ کر کرنا چاہیے ورنہ اثر بہت کم ہوگا۔

کیا جہاد میں شریک ہونیوالوں پر قرآن نفاق کا حکم لگاتا ہے اور کیا جہاد ہی وہ کسوٹی ہے جس پر آدمی کا ایمان پرکھا جاتا ہے؟ اور کیا نظام حق کی سعی

آیت ۹۱ سورہ توبہ کے مطابق کمزوروں، بیماروں معذوروں پر تو عدم شرکت جہاد کا کوئی گناہ سرے سے ہی نہیں ہے اور آیت ۱۷ سورۂ فتح سے بھی

میں کمزوری دکھلانے والے کا ایمان ہی مشتبہ ہے!

آیت ۹۵، ۹۶ سورہ نسا میں جہاد میں شرکت کرنے والوں کا درجہ بلا عذر گھر بیٹھ رہنے والوں سے بدرجہا بڑھا ہوا بتلایا گیا ہے۔ مگر اچھے گھر یعنی جنت کا وعدہ دونوں سے کیا ہے۔ اس سے ان کے عدم نفاق کا پتہ چلتا ہے۔

آیت ۳۸، ۳۹ سورہ توبہ میں غزوۂ تبوک میں جہاد پر نہ نکلنے والوں کو عذاب کی بھی دھمکی دی ہے اور ان کی جگہ دوسری قوم پیدا کرنے کی وعید بھی سنائی ہے مگر ان کو منافق نہیں کہا۔

آیت ۴۴، ۴۵ سورہ توبہ کا ترجمہ ملاحظہ ہو ——

"جو لوگ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ اپنے جان و مال سے جہاد کرنے کے بارہ میں (عدم شرکت کی کبھی) آپ سے رخصت نہ مانگیں گے اور اللہ تعالےٰ ان متقیوں کو خوب جانتا ہے۔ البتہ وہ لوگ آپ سے رخصت مانگتے ہیں جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے اور ان کے دل شک میں پڑے ہوئے ہیں سو وہ اپنے شکوک میں پڑے ہوئے حیران ہیں۔"

اس سے زیادہ سے زیادہ یہ استدلال ہو سکتا ہے کہ منافق لوگ ہی جہاد میں عدم شرکت کی اجازت چاہتے ہیں۔ نہ یہ کہ جو شرکت نہ کرے وہ منافق ہے۔ مطلب یہ کہ جن کے دل میں پہلے ہی سے ایمان نہ تھا انہوں نے جہاد میں شرکت سے بچنا چاہا یہ نہیں کہ عدم شرکتِ جہاد سے وہ منافق قرار دیئے گئے ——

آیت ۷۱ تا ۷۳ سورہ نساء سے بھی یہی مطلب نکلتا ہے کہ —— اے مسلمانو تمہارے مجمع میں بعض منافق ہیں جو جہاد سے ہٹتے ہیں اور فلاں فلاں کام کرتے ہیں۔ نہ یہ کہ تم میں سے جو جہاد سے ہٹے وہ منافق ہے اور یہ حقیقت ہے کہ منافق مسلمانوں میں ملے جلے رہتے تھے۔

غرض ہمارے ناقص مطالعہ قرآن کی حد تک تو ہمیں قرآن کی کوئی آیت ایسی نہ ملی جس میں جہاد سے بچنے والوں پر قرآن نے نفاق کا حکم لگایا ہو —— البتہ قرآن سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ منافقین کو باوجود ان کی شرکتِ جہاد کے مومن نہ سمجھا گیا۔ تاہم چونکہ ہمارا علم بہرحال مولانا کے علم کے سامنے کوئی چیز نہیں وہ مفسرِ قرآن ہیں، قرآن کو ہم سے کہیں زیادہ سمجھتے ہیں۔ اگر وہ اپنے دعوے کو قرآن سے کما حقہ ثابت کر دیں تو ہم

اپنے خیال سے رجوع کریں گے۔ اور یہ تو ان جہادوں کا ذکر ہے جو یا تو فرض عین تھے ہی یا فرض کفایہ ہوتے ہوئے بھی حضورؐ کی خواہش کا احترام کرنے کے لحاظ سے فرض عین ہی کی طرح قابل شرکت تھے۔ جب ان بابرکت جہادوں میں بھی عدم شرکت کو نفاق نہیں سمجھا گیا تو آجکل محض زمام کار کی تبدیلی کے لئے کئے جانے والے جہاد میں حصہ نہ لینے والوں پر نفاق کا حکم لگانا یا ان کے ایمان کو مشتبہ سمجھنا ہرگز قرآن کا حکم نہیں ہو سکتا۔ جب کہ احقر بخوبی ثابت کر چکا ہے کہ اس قسم کا جہاد ہمارے زمانہ میں فرض کفایہ کا درجہ بھی نہیں رکھتا اور بفرض محال اگر رکھے بھی تو فرض کفایہ کے تارک یا اس میں سستی دکھانے والے پر نفاق کا حکم لگانا ایک نئی شریعت بنانا ہے ——— غزوۂ تبوک میں باوجود عدم شرکت پر وعید سن لینے کے بعض صحابہ نے محض لاابالی یا کاہلی سے شرکت نہیں کی۔ تاہم ان کو منافق قرار نہیں دیا گیا۔ بلکہ ان کا قصور معاف فرمایا گیا۔

اور اگرچہ مولانا ممدوح نے اس نفاق کے حکم کو صرف قرآن ہی کی طرف منسوب کیا ہے تاہم تبرعاً ہم حدیث سے بھی اس کا غلط ہونا ثابت کئے دیتے ہیں ——— صحیح بخاری کی حدیث ہے کہ ———

"فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جو شخص اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لایا اس کا حق اللہ پر ہے کہ اُسے جنت میں داخل کرے۔ خواہ وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرے یا اپنے گھر بیٹھا رہے۔

اور مسلم کی حدیث میں ہے کہ ———

انسانوں میں بہترین زندگی اُس شخص کی ہے جو خدا کی راہ میں اپنے گھوڑے کی باگ پکڑے، اس کی پشت پر سوار ہو اور جب خوف و فریاد کی آواز سنے تو فوراً اس کی طرف دوڑ جائے اور قتل اور موت کو تلاش کرے۔ جہاں کہیں اس کے خیال میں یہ چیزیں ہوں۔ پھر اس شخص کی زندگی بہترین زندگی ہے جو پہاڑ کی چوٹی پر اپنی بکریوں میں رہتا ہو یا کسی وادی میں اور نماز پڑھتا ہو زکوٰۃ دیتا ہو۔ اور اپنے پروردگار کی عبادت کرتا ہو یہاں تک کہ موت سے ہم کنار ہو جائے۔

دیکھئے ان حدیثوں میں خصوصاً اول الذکر میں عدم شرکت جہاد پر عدم ایمان یا نفاق کا حکم نہیں لگایا گیا۔ اور نماز کے بیان میں احقر دو مزید حدیثوں کا حوالہ دے چکا ہے۔ جن میں بزدلی کی بنا پر عدم شرکت جہاد کا بدل ذکر اللہ کو فرمایا گیا ہے۔ بلکہ ذکر اللہ کو جہاد سے افضل بتلایا

گیا ہے۔

البتہ ایک حدیث مسلم کی یہ ضرور ہے ـــــــــــ

"جو شخص مرا اور جہاد نہ کیا اور جہاد کا خیال بھی کبھی دل میں نہ لایا اس کی موت ایک قسم کے نفاق پر ہوئی "

تو اول تو یہ وعید ایسے شخص کے لئے ہے جس کے زمانہ میں جہاد ہوتے رہے ہوں۔ یعنی جہاد کی عام فضا ہو نہ کہ ہم لوگوں کے لئے جو ٹھیک طور سے اس کا مطلب بھی نہیں سمجھتے اور جنہوں نے ساری عمر کوئی جہاد نہ ہوتے دیکھا اور نہ اس کا تذکرہ سنا اور اگر خلافِ حقیقت، حدیث کو ہر زمانہ کے لئے عام ہی سمجھے تو اس کا اطلاق اس مسلمان پر ہوگا۔ جس کا یہ ارادہ ہو کہ کسی شرعاً صحیح جہاد میں بھی وہ جان یا مال کیساتھ کسی قسم کی شرکت نہیں کرے گا۔ ـــــــ سو احقر کے خیال سے ایسا مسلمان کوئی نہ ملے گا اور اگر شاذ کوئی ایسا ہو تو حدیث کی وعید اس کے حق میں درست ہے۔ تاہم حضورؐ نے اس کو بھی پورا منافق نہیں فرمایا بلکہ اس کے اندر ایک قسم کا نفاق بتلایا ہے۔ جس سے اس کا جنت سے مایوس ہونا لازم نہیں آتا۔ دوسرے یہ وعید ایسی ہی ہے جیسے تارک صلوٰۃ کو حضورؐ نے کافر کہا ہے

"من ترک الصلوٰۃ متعمداً فقد کفر" ـــــ سو جیسے اس حدیث میں ایسے شخص پر فقہا کے نزدیک کفر لازم نہیں آتا۔ اُس حدیث میں بھی نفاق لازم نہیں آتا۔

غرض جہاد میں شرکت نہ کرنا نفاق کی دلیل نہ قرآن کی رو سے ہے اور نہ حدیث کی۔ اسی سے یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ جہاد[1] ایمان پرکھنے کی کسوٹی تو کم ہاں شجاعت اور بزدلی پرکھنے کی کسوٹی ضرور ہو سکتا ہے اور قیامِ نظامِ حق کے لئے جہاد بہت سے بہت فرض کفایہ ہے اس میں حصہ نہ لینے والے کے ایمان کو مشتبہ سمجھنا ایک نئی شریعت بنانا ہے اور احقر کے نزدیک تو آجکل ایسا جہاد فرض کفایہ بھی نہیں۔

اگر مولانا یہ فرما دیں کہ جی چرانے اور منہ موڑنے سے میرا مطلب محض عدم شرکت نہیں بلکہ اس کے

---

[1] آیت ۱۵۵ سورہ بقرہ میں ایمان پرکھنے والی چیزوں کا ذکر ہے مگر ان میں یہ فرض کفایہ والا جہاد شامل نہیں۔ البتہ آیت ۳۱ سورہ محمدؐ سے ایمان کے مقتضیات پر عمل کا امتحان ضرور مترشح ہوتا ہے نہ کہ نفسِ ایمان کا ورنہ بلا عذر گھر بیٹھنے والے ایمان سے خالی قرار دیئے جاتے ۔

جواز میں حیلے بہانے تراشنا بھی ہے تو اس کا جواب اس عنوان کی ابتدائی تقریر میں آچکا ہے کہ جنہوں نے ایسا کیا وہ پہلے سے ہی منافق تھے۔ نہ یہ کہ ایسا کرنے پر وہ منافق قرار دیئے گئے۔

اگر مولانا کا اشارہ علماء و مشائخ کی طرف ہو جیسا کہ اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے۔ تو جواب یہ ہے کہ ان حضرات کے استدلالات بابت عدم جواز یا عدم وجوب جہاد کو حیلے بہانے قرار دینا محض مولانا کی شوخی ہے اور جب ان کے اتباع کے موجب ان کی دعوت قبول نہ کرنے پر مسلمان قوم یہودی قوم کی پوزیشن اختیار کر چکی ہو تو افہام و تفہیم کی گنجائش ہی کہاں رہ گئی۔

یہاں تک مولانا کے دو ضمنی نظریوں پر کلام ہو چکا اب ہم ان کے خاص نظریہ یا تعبیر دین پر غور کریں گے۔

(۳)

کیا امامت صالحہ کا قیام دین کا حقیقی مقصود ہے اور کیا یہی کتابِ الٰہی کا مطالبہ اور سنتِ انبیاءؑ ہے؟

مولانا مودودی کے اس خاص نظریہ کا جائزہ لینے کے قبل دین کی ایک صحیح تعریف متعین کر لی جائے جو احقر کے نزدیک —— " اپنے مقصد تخلیق کے تقاضوں کو پورا کرنے کا ایک اصولی دستور ہے۔"

مقصد تخلیق ہمارا خود اللہ پاک نے قرآن میں آیت —— وَمَا خَلَقْتُ الجِنَّ وَالانسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْن —— کے مطابق عبادت بتلایا ہے۔ پس دین بھی اسی کے اظہار کا عملی ضابطہ ہے۔ عبادت انتہائی محبت اور انتہائی تذلل کے ملے جلے جذبات کا نام ہے۔ اسی لئے ہمارے دین کا نام اسلام ہوا۔ جس کے معنی ہیں " گردن بطاعت نہادن " یعنی اطاعت کے لئے گردن جھکا دینا۔ اطاعت " طوع " سے مشتق ہے۔ یعنی ایسی فرماں برداری جو رغبت کے ساتھ ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز بلا محبت اور بلا استحضارِ عظمتِ حق کے ممکن نہیں۔ اس لئے

ضروری ہے کہ بندہ معرفتِ حق حاصل کرے اپنا اور اپنے خالق کا مقام پہچانے، اس کی بے پناہ عظمت اور اپنا اس کے مقابلے میں عجز محسوس کرے۔ اس سے خود بخود عبادت کا داعیہ پیدا ہوگا۔ بندہ چاہے گا کہ اس کی زندگی اس کے خالق رب کی رضا کے مطابق گزرے۔ چونکہ اپنی عقل سے یہ معلوم کرنا ممکن نہ تھا کہ کیا کام ایسے ہیں جن سے آقا خوش ہوتا ہے۔ اور کن باتوں سے وہ ناخوش ہوتا ہے لہٰذا اللہ کی رحمت اس کو متقضی ہوئی کہ بندوں کو اپنی مرضیات اور نامرضیات سے اپنے خاص بندوں یعنی رسولوں کی معرفت آگاہی بخشے اور یہ خاص بندے عملی طور پر ان احکام پر چل کر رب چاہی زندگی کا نمونہ بندوں کو دکھلادیں۔

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے ـــــ لیعبدون ـــــ کی تفسیر لیعرفون ـــــ سے فرمائی ہے۔ کہ بندے مجھے پہچانیں ـــــ اور ایک حدیث قدسی ہے جو اسناد کے لحاظ سے تو مسلم الثبوت نہیں مگر اپنے مضمون کے اعتبار سے صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ

"میں ایک خزانہ مخفی تھا۔ مجھے یہ چیز بھلی لگی کہ میں پہچانا جاؤں۔
پس میں نے کائنات کو پیدا کر دیا۔"

صوفیائے کرام اس حدیث کو صحیح مانتے ہیں اور حق یہ ہے کہ اس کے علاوہ تخلیقِ کائنات کی اور کوئی معقول وجہ متعین بھی نہیں کی جاسکتی گو ہمیں اس چیز سے زیادہ سروکار نہ ہو۔

پس دین کا حقیقی مقصود اللہ کو ذاتی وصفاتی طور پر اپنی بساط بھر پہچان کر اس کی مرضیات پر چلنا اور نامرضیات سے بچنا ہے تاکہ اس کی رضا اور قرب حاصل ہو۔ یا یوں کہیے کہ دین کا حقیقی مقصود ـــــ "عبد شدن یا عبدیت یعنی بندہ ہونا ہے"۔

عملی حیثیت سے دین کے پانچ اجزا ہیں۔ یعنی عقائد، عبادات، معاملات، معاشرت اور اخلاقِ باطنیہ۔ ان پانچوں اجزاء کو حکم الٰہی اور سنتِ رسول ؐ کے مطابق اختیار کرنا دینداری ہے امامت صالحہ کا قیام بے شک دینداری کے تقاضوں کو پورا کرنے میں معین ہے۔ اور آیت ۵۵ سورۂ نور کے مطابق کامل دینداری پر بطور انعام واحسان موعود بھی ہے۔ مگر اس سے یہ کیسے لازم آیا کہ وہی مقصود بھی ہے؟ معین کو مقصود کہنا بہر حال صحیح نہیں ہے اور اگرچہ مولانا کے نظریہ کی تغلیط کے لئے صرف یہی ایک دلیل کافی ہے۔ مگر ہم قرآن وحدیث اور عقل سے بھی ذیل میں

اس پر مزید دلائل پیش کرتے ہیں۔

ا ــــ قرآنی دلائل

ا ــــ اگر دین کا حقیقی مقصود امامت صالحہ کا قیام ہوتا تو اس اہم ترین چیز کو اللہ تعالےٰ قرآن میں صاف صاف کیوں نہ بیان فرماتے تاکہ ہر مسلمان کو یہ بات ہر وقت مستحضر رہتی خصوصاً جب کہ قرآن کا دعویٰ ــــ مُبین ہدیً تبیاناً لکلِ شئ ، یسّرنٰہ لِذکر وغیرہ ہونے کا ہے۔ اور یہ بھی ہے کہ اس کی آیتیں بالکل واضح ہیں اور اس میں ہر ضروری چیز بار بار بیان ہوئی ہے۔ پس اگر مولانا کے خیال سے کوئی واضح آیت ایسی ہو جو دین کے اس مقصود حقیقی یعنی قیام امامت صالحہ پر دلالت کرتی ہو۔ تو ہم جیسے عامیوں کو بھی بتلانے کی زحمت فرمادیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اس کا کوئی دوسرا مطلب نہ نکالا جاسکے۔

مولانا اور دوسرے اہل جماعت بہت زور مار کر ایک آیت ــــ ھوالذی ارسل رسولہ بالھدیٰ و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ــــ اپنے مقصد میں پیش کرتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ اس میں اسلام کا دوسرے ادیان پر دینی غلبہ مراد ہے نہ کہ اہل اسلام کا دوسرے مذاہب والوں پر سیاسی غلبہ۔ دینی غلبہ کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے دین والے یا لا مذہب لوگ اسلام کی حقانیت اور اس کے اصولوں کی اپنے مذہب کے اصولوں یا لا مذہبی کے مقابلہ میں برتری محسوس کریں، ان کے قلوب اسلام قبول کرنے کی طرف راغب ہوں اور رفتہ رفتہ یہ غالب اکثریت کا مذہب بن جاوے۔ جس کا نتیجہ ان ممالک میں خود بخود سیاسی غلبہ ہو جانا بھی تھا۔ یعنی سیاسی غلبہ نتیجہ میں حاصل ہونے والی چیز تھی۔ بشرطیکہ تبلیغ بلا مزاحمت جاری رہتی۔ نہ کہ یہی مقصود حقیقی تھا۔

اگر کوئی کہے کہ پھر اس کے لئے قتال حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں کیا؟ تو جواب یہ ہے کہ عرب ایک وسیع ملک ہے اس کے کچھ حصہ میں مذہبی غلبہ کے نتیجہ میں سیاسی غلبہ بھی ہو جانے سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ سارے ملک میں اسلام کی مخالفت یا اس کی تبلیغ میں مزاحمت کا فی الحال یا فی الاستقبال کا احتمال ہی باقی نہ رہا تھا۔ کفار اور ان کی مخالفتیں اور مزاحمتیں بہر حال باقی تھیں۔ انہیں کو قتال کے ذریعے دور کیا گیا۔ جس کا طریقہ محض یہ تھا کہ حضورؐ چھوٹے چھوٹے

مسلح دستے اطراف ملک میں بھیجتے تھے۔ اگر ان دستوں کو کسی مقام کے لوگوں کی بابت یہ معلوم ہوجاتا کہ یہ ایمان لے آئے ہیں ان سے کوئی تعرض نہ کرتے ورنہ معمولی دعوتِ اسلام کے بعد پھر قتال کرتے تھے۔ حتیٰ کہ وہ مسلمان ہوجائیں یا اسلامی حکومت کی رعایا بننا پسند کریں۔ تاہم بہت تھوڑے آدمی قتل ہوئے اور حق یہ ہے کہ بلا اسکے کفار کی مزاحمت کا احتمال ختم نہ ہوتا ان کو یہ معلوم نہ ہوتا کہ اب ہم آزاد نہیں بلکہ ایک حکومت کی رعایا ہیں اگر اس کے کام میں مزاحم ہوں گے تو پچھتیں گے ——— نیز جیسا کہ ہم اوپر واضح کر چکے ہیں۔ اس وقت حکومت کی بڑی ضرورت اس وجہ سے بھی تھی کہ اسلام کے سیاست اور انتظام ملکی سے متعلق قوانین بھی عملی طور پر واضح ہوجائیں۔ اور یہ دین کامل ہوجائے۔

پس ہمارا دعویٰ ہے کہ آیت مذکورہ میں سیاسی غلبہ سرے سے مراد نہیں، مذہبی غلبہ مراد ہے اور یہی غلبہ ہدایت اور سچے دین کے ذریعے ہوسکتا ہے۔ اگر سیاسی غلبہ مراد ہوتا تو ہدایت اور سچے دین کے ذکر کی ضرورت نہ ہوتی۔ کیونکہ یہ چیزیں سیاسی غلبہ کا ذریعہ یا ہتھیار بہرحال نہیں بن سکتیں۔ اور مذہبی غلبہ کے نتیجہ میں سیاسی غلبہ ہوجانا بھی پہلے زمانہ ہی میں ممکن تھا۔ کیونکہ مخالفین کے پاس بھی اسی قسم کا اسلحہ تھا جیسا مسلمانوں کے پاس۔ اب سیاسی غلبہ مذہبی غلبہ پر موقوف نہیں۔ دیکھئے امریکہ نے محض دو ایٹم بم گرا کر جاپانیوں کے مذہبی غلبہ کے باوجود ان پر سیاسی غلبہ کر لیا تھا ——— غرض ہم سیاسی غلبہ کے محمود ہونے کے قائل تو ضرور ہیں مگر اس کے مقصود ہونے کے قائل نہیں۔ مقصود بہرحال مذہبی غلبہ ہی ہے اور سیاسی غلبہ حصول مقصود کی راہ میں حائل ہونے والی مزاحمتوں کے دفعیہ کے لئے ہے۔

۲ ——— اگر نظام حق کا قیام ہی دین کا مقصودِ حقیقی ہوتا تو اس کی سعی میں حصہ نہ لینے والوں کو عذاب کی دھمکی ضرور دی جاتی[1]۔ جیسے ہجرت نہ کرنے والوں کو سورۂ نسا آیت ۹۷ میں دی گئی ہے مگر آیت ۹۵، ۹۶ سورۂ نسا میں بلا عذر گھر بیٹھنے والوں سے بھی جنت کا وعدہ کیا گیا ہے کیا یہ کھلا ثبوت مولانا کے خیال کے غلط ہونے کا نہیں ہے

---

[1] آیت ۲۶ سورہ نور میں کمی چیزوں پر بحیثیت مجرمی کوئی سزا کا حکم بھیجنے کا ذکر ہے جو عذاب جہنم نہیں بلکہ موت کا حکم معلوم ہوتا ہے اور آیت ۱۶ سورہ محمد میں جو عذاب کا ذکر ہے اس کی وجہ دوسری ہے جو بخوفِ طوالت تحریر نہیں کی جارہی۔

۳ ——— آیت ۲۰ تا ۲۶ سورۃ مائدہ میں ان بنی اسرائیل کا ذکر ہے جنہوں نے عمالقہ پر جہاد کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ بلکہ یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ تو اور تیرا خدا جا کر لڑیں۔ ہم تو یہیں بیٹھے ہیں اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بہت رنج ہوا تھا اس پر بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو کافر نہیں فرمایا بلکہ صرف یہ سزا دی کہ ملک شام ان کو چالیس سال تک نہ ملے گا۔ اگر یہ حقیقی مقصود دین کا ہوتا تو اگر کافر بھی نہ فرماتے تو جہنم کے سخت عذاب کی وعید تو سناتے۔ ویسے تو مقصود حقیقی سے روگردانی پر کفر ہی عائد ہونا چاہیئے۔

۴ ——— قیام حکومت صالحہ بہر حال فرض کفایہ ہے اور فرض کفایہ دین کا حقیقی مقصود نہیں ہو سکتا۔

۵ ——— آیت ۱۱۱ سورۃ توبہ میں جہاد کرنے والوں کو جنت کی بشارت دے کر اگلی آیت ۱۱۲ میں ان کے اوصاف یہ بتلائے گئے ہیں۔

"وہ ایسے ہیں جو توبہ کرنے والے ہیں، روزہ رکھنے والے ہیں۔ رکوع و سجدہ کرنے والے ہیں۔ نیک باتوں کی تعلیم کرنے والے اور بُری باتوں سے باز رکھنے والے اور اللہ کی حدود کا خیال رکھنے والے ہیں۔ اور ایسے مومنین کو آپ خوشخبری سنا دیجئے۔"

اس سے ظاہر ہے کہ جنت کا وعدہ تو انہیں اوصاف پر ہے ہاں جہاد کی وجہ سے ان کے درجات بہت بلند ہو جائیں گے۔ مقصود اعلیٰ بہر حال جہاد نہیں ہے۔ بلکہ انہیں چیزوں کے ذریعے مقام عبدیت کا حصول ہے جس پر جنت ملتی ہے۔

۶ ——— آیت ۱۲۲ سورہ توبہ کا ترجمہ تفسیری ملاحظہ ہو

"اور ہمیشہ کے لئے، مسلمانوں کو یہ (بھی) نہ چاہیئے کہ جہاد کے لئے (سب کے سب ہی) نکل کھڑے ہوں (کہ اس میں بعض اوقات مسلمانوں کا ضرر ہے)، سو ایسا کیوں نہ کیا جاوے کہ ان کی ہر ہر بڑی جماعت میں سے ایک ایک چھوٹی جماعت جہاد میں جایا کرے (باقی اپنے وطن میں رہ جایا کریں)، تاکہ رہ (باقی ماندہ لوگ (حضورؐ کی موجودگی میں آپ سے اور آپ کے بعد علماء شہر سے) دین کی سوجھ بوجھ حاصل کرتے رہیں اور تاکہ یہ لوگ

اپنی (اس) قوم کو (جو کہ جہاد میں گئے ہیں) جب کہ وہ ان کے پاس واپس آئیں (دین کی باتیں سُنا کر خدا کی نافرمانی سے) ڈرا دیں تاکہ وہ (سن کر بُرے کاموں سے) احتیاط رکھیں۔"

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مقصود کیا ہے۔ مولانا مودودی نے جہاد کے بجائے علم دین سیکھنے کے لئے جانا تفہیم میں اس آیت کے مفہوم میں لکھا ہے جو صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اوّل تو علم دین سیکھنے کے لئے زیادہ لوگ خود ہی تیار نہیں ہوتے اور اگر ہوں بھی تو اس کے لئے کیا قباحت لازم آتی ہے جو روکا جائے۔ اور پتہ نہیں مولانا نے ان لوگوں کو دیہاتی مسلمان ہی کیوں قرار دے لیا۔

۷ ـــــ آیت ۴۱ سورہ حج کا ذکر اوپر کہیں آچکا ہے جس میں مسلمانوں کے اوصاف بیان کئے ہیں کہ اگر ہم انہیں حکومت دیدیں تو یہ خود بھی نماز زکواۃ کی پابندی کریں اور دوسروں سے بھی کرائیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر خوب کریں۔ اس سے دو باتیں ثابت ہوئیں ایک تو یہ کہ حکومت بہرحال خدا کے دینے سے ملتی ہے۔ اپنی کوشش پر اس کا حصول ضروری نہیں دوسرے یہ کہ اس کی غرض بھی تمکین و تبلیغ دین ہی ہے حکومت بذاتِ خود مقصود نہیں۔

۸ ـــــ آیت ۵۵ سورہ نور میں حکومت کو کمال ثبات فی الدین پر بطور انعام کے موعود فرمایا ہے۔ اور اس کا فائدہ تمکین دین اور تبدیل خوف بالامن بتلایا ہے۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ حکومت مقصود بالذات نہیں ہے۔ بلکہ مقصود وہ چیز ہے جس پر وہ بطور انعام ملتی ہے۔

۹ ـــــ قرآن ایمان اور عمل صالحہ پر جنت ملنے کے ذکر سے بھرا پڑا ہے۔ اور چند آیتوں کے علاوہ جن کی تعداد تین چار سے زائد نہیں اعمال صالحہ کی تفصیل میں جہاد یا قیام امامت صالحہ کا ذکر کہیں نہیں آیا۔ اٹھاسی مکی سورتوں کو چھوڑ کر ہم محض مدنی سورتوں میں سے ایسی سورتوں کا حوالہ ذیل میں دیتے ہیں اور بخوف طوالت ان کا ترجمہ نہیں لکھ رہے۔ قارئین کرام کسی بھی مترجم قرآن سے دیکھ سکتے ہیں۔ مدنی سورتوں میں بھی اکثر جہاد کا ذکر نہ فرمانا اور باقی اعمال صالحہ پر ہی جنت بلکہ اس کے درجات عالیہ کا وعدہ فرمانا ثابت کرتا ہے کہ قیام امامت صالحہ ہی دین کا حقیقی مقصود نہیں ہے۔

سورۃ البقرہ آیت ۳ تا ۵، آیت ۶۲ میں صرف اللہ اور یوم قیامت پر ایمان رکھنا اور اچھے عمل کرنا ہی موجب جنت تبلایا گیا۔ آیت ۱۰۹، ۱۱۰ میں جہاد کا حکم ملنے سے پیشتر نماز اور زکوٰۃ ہی کو پورا دین کہا گیا ہے۔ آیت ۱۷۷ میں اچھے مسلمانوں کی بہت سی صفات بتلا کر آخر میں معرکۂ قتال میں صبر کرنا بھی ایک صفت رکھی گئی۔ اس سے قتال کا درجہ باقی اعمال سے کم ظاہر ہوتا ہے۔

سورۃ آل عمران ——— آیت ۱۶، ۱۷، آیت ۱۱۰ میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی صفت پر اس اُمت کو خیر الامم کا معزز لقب عطا فرمایا گیا ہے اور گو آیت کے الفاظ میں جہاد کا ذکر نہیں مگر علماء محققین نے وجہ خیریت یہی اخذ کی ہے کہ یہ امت تبلیغ کا کام زیادہ اہتمام کے ساتھ کرتی ہے حتیٰ کہ اگر تبلیغ میں مزاحمت ہو تو اس کو دور کرنے کے لئے قتال بھی کر سکتی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ قتال لذاتہٖ نہیں بلکہ اصل مقصود میں سہولت کے لئے ہے۔ آیت ۱۱۴، ۱۱۵ میں اسلام لانے والے یہودیوں کے اوصاف میں بھی جہاد کرنے کا ذکر نہیں۔

سورۂ نساء ——— آیت ۳۶، آیت ۱۶۲ میں اسلام لانے والے یہودیوں کے اوصاف بلا ذکر جہاد، ۱۷۳

سورۂ مائدہ ——— آیت ۹، ۵۵، ۶۹ میں جنت کا وعدہ ایمان باللہ و اعمال صالحہ اور ایمان بالآخرت پر ہی، ۱۲ میں بنی اسرائیل کے میثاق میں نماز وغیرہ کے ساتھ رسولوں کی مدد کا ضرور آیا ہے مگر مراد دشمنوں سے محافظت ہے نہ کہ قیام حکومت صالحہ۔

سورۂ انفال ——— آیت ۲ تا ۴، آیت ۲۰ تا ۳۰ میں ایمان والوں کو نصیحتیں فرمائی ہیں بلا ذکر جہاد۔

سورۂ توبہ ——— آیت ۱۸ میں اللہ کی مسجدیں آباد کرنے والوں کے اوصاف بلا ذکر جہاد، ۷۱، ۷۲، ۱۰۰۔

سورۂ رعد ——— آیت ۲۰ تا ۲۳ میں مسلمانوں کے اوصاف بلا ذکر جہاد۔

سورۂ حج ——— آیت ۱۴، ۲۳، ۳۵ میں مسلمانوں کے اوصاف اور آخری رکوع میں نماز اور زکوٰۃ کا حکم۔

سورۂ نور ——— آیت ۳۶ تا ۳۸ میں مسجدوں میں اللہ کا ذکر کرنے والوں کے

اوصاف بلاذکر جہاد۔

سورۂ احزاب ——— آیت ۳۵ میں اجرِ عظیم کے مستحق مردوں اور عورتوں کے اوصاف بلاذکر جہاد۔ ۴۱ تا ۴۴۔

سورۂ محمد ——— آیت ۲، ۱۲ میں اعمال صالحہ اور ایمان پر جنت کا وعدہ بلاذکر جہاد

سورۂ فتح ——— آیت ۲۹ میں صحابہؓ کرام کے اوصاف جو توریت اور انجیل میں بھی مذکور بتلائے گئے ہیں بلاذکر جہاد۔

سورۂ حجرات ——— آیت ۱۵ میں دعویٰ ایمان میں پورے سچے لوگوں کے اوصاف یہ بتلائے گئے ہیں ———

"جو اللہ اور رسول پر ایمان لائے پھر کبھی شک نہیں کیا، پھر اپنے جان و مال سے خدا کے دین کے راستے میں محنت اٹھائی (اس میں جہاد وغیرہ سب آگیا) یہی لوگ ہیں سچے (یعنی پورے سچے)"

اس میں جہاد کا مفہوم ضرور ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر وہ جہاد نہ کرتے تو جھوٹے شمار ہوتے بلکہ یہ ہے کہ یہ لوگ بڑے درجہ والے ہیں۔ ویسے جنت کا استحقاق نفس ایمان پر بھی ہو جاتا ہے

سورۂ حدید ——— آیت ۱۹ میں ہے کہ ———

"جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ اپنے رب کے نزدیک صدیق اور شہید ہیں۔ ان کے لئے ان کا اجر اور نور ہوگا"

یہاں نفس ایمان پر ہی درجات عالیہ کا وعدہ فرمایا گو اعلیٰ درجہ کا ایمان پابندیٔ اعمال صالحہ کے ساتھ ہی مراد ہے۔ تاہم نظامِ حق کی سعی کا ان میں ہونا لازم نہیں۔

سورۂ طلاق ——— آیت ۱۱

سورۂ دہر ——— آیت ۵ تا ۲۲ میں ابرار یعنی نیک لوگوں کی حسنات کا ذکر اور ان کو ملنے والی جنت کا ذکر تفصیل سے ہے۔ مگر اس میں قیام نظامِ حق کا ذرہ برابر تذکرہ نہیں۔

سورۂ بینۃ ——— میں اخلاص سے عبادتِ خدا کرنے، نماز اور زکوٰۃ کو دین قیم فرمایا گیا بلاذکر جہاد۔

۲ ——— دلائل از احادیث

چار حدیثوں کا حوالہ تو پچھلی سرخی "کیا جہاد میں شریک نہ ہونے والوں پر قرآن نفاق کا حکم لگاتا ہے۔" کے تحت دیا گیا ہے۔ وہ اس موضوع کے لئے گئی حجت ہیں۔

۵ ——— فرمایا حضورؐ نے دنیا میں تین قسم کے مومن ہیں۔ ایک تو وہ جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور پھر کسی شک وشبہ میں مبتلا نہ ہوئے۔ اور خدا کی راہ میں اپنی جان ومال سے جہاد کیا (سورۃ حجرات آیت ۱۵ کا مضمون ہے) دوسرے وہ جن کے ہاتھوں سے مسلمانوں کے جان ومال محفوظ ہوں۔ تیسرے وہ جن کے دلوں میں طمع کی خواہش پیدا ہوئی۔ لیکن وہ اپنی خواہش کو خدا کی خوشنودی کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔

۶ ——— حضرت اویس قرنیؓ جنہوں نے نہ کبھی حضورؐ کی زیارت کی اور نہ کسی جہاد وغیرہ میں حصہ لیا تاہم حضورؐ نے صحابہؓ کو وصیت کی کہ تم ان کو میرا سلام پہنچانا اور اپنے حق میں دعا کرانا۔ ظاہر ہے کہ اگر دین کا حقیقی مقصود نظامِ حق کی سعی ہوتا تو حضرت اویس قرنیؓ ہرگز حضورؐ کی نظر میں یہ رتبہ نہ رکھتے۔

۷ ——— حدیث میں آیا ہے کہ کسی مسلمان نے جہاد میں شرکت کی اجازت چاہی حضورؐ نے اس سے دریافت کیا کہ کیا تیرے والدین زندہ ہیں اس نے بتلایا کہ ہاں زندہ ہیں، حضورؐ نے فرمایا کہ جا ان کی خدمت کر۔ اگر نظامِ حق کی سعی مقصودِ حقیقی دین کا ہوتا تو آپؐ اس کے حصول سے اس مسلمان کو کیوں روکتے؟۔

۸ ——— اہلِ جماعت اسلامی کا خیال ہے کہ حضورؐ کا عزم ابتدا نبوت سے ہی ایک حکومت عادلانہ کا قیام تھا۔ اور جناب نعیم صدیقی نے اپنی مشہور "محسنِ انسانیت" نامی کتاب کے شاید پہلے ہی باب میں اس واقعہ سے اس کو ثابت کیا ہے۔ جس میں حضرت ابوطالب کی علالت کے سلسلے میں چند سردارانِ قریش عیادت کو آئے تھے۔ انہوں نے حضورؐ کی شکایت کی تھی۔ حضورؐ بلوائے گئے تھے اور حضرت ابوطالب نے آپ سے دریافت کیا تھا کہ تم قوم سے کیا چاہتے ہو؟ اور آپ نے فرمایا تھا کہ میں ان سے صرف ایک کلمہ چاہتا ہوں۔ اگر یہ لوگ اُسے کہہ لیں تو پورے عرب پر ان کی حکومت ہو جائے اور عجم ان کو خراج دینے لگے۔ اس پر غالباً

ابوجہل نے کہا تھا کہ ہم تو دس کلمے کہنے کو تیار ہیں مگر جب حضورؐ نے کلمۂ طیبہ کہلوانا چاہا تو وہ سب یہ کہتے ہوئے اٹھ گئے۔ کہ خوب اتنے الٰہوں کی بجائے بس ایک ہی الٰہ مان لیں۔

احقر کہتا ہے کہ ——— حضورؐ کے اس قول سے یہ استدلال پکڑنا کہ دین کا حقیقی مقصود ہی امامت صالحہ کا قیام ہے ایک سطحی استدلال ہے جو درست نہیں۔ یہ تو حضورؐ نے ان لوگوں کو ——— اُخروی تحبیونہا ——— کے طور پر ان کی ذہنیت کے مطابق دین کا دنیوی فائدہ بتلایا تھا کیونکہ آخرت کے وہ قائل ہی نہ تھے پس ثمرہ عاجلہ ہی کا لالچ دکھلا کر ان کو دین کی طرف راغب کرنا مناسب تھا۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی بچے کو جو پڑھنے سے جی چراتا ہو باپ یہ کہے کہ اگر تم پڑھوگے تو ہم تمہیں گھڑی دیں گے۔ یقیناً باپ کو اسے تعلیر یافتہ بنانا مقصود ہے نہ کہ محض گھڑی دینا۔

اس واقعہ سے زیادہ سے زیادہ استدلال یہ ہو سکتا ہے کہ حضورؐ بطور ایک ضمنی فائدہ کے تبلیغ اسلام اور اس سے پیدا شدہ دینی غلبہ کے نتیجہ میں ایک حکومت کا قیام بڑی حد تک ممکن سمجھتے تھے۔ مگر یہ کہاں لازم آتا ہے کہ تبلیغ اسلام سے حکومت ہی آپکو مقصود تھی جو آپ کے فرض تبلیغ کے مقابلہ میں ایک ادنیٰ اور حقیر چیز ہے اور کسی طرح تبلیغ یا دین کا حقیقی مقصود نہیں ہو سکتی۔

قرآن سے زائد حدیثیں اس مضمون سے بھری پڑی ہیں کہ اعمال صالحہ پر جنت ملے گی۔ پس دین سے مقصود وہ اعمال ہی ہیں۔ جن سے مقام عبدیت کی تکمیل ہو کر رضا و قرب الٰہی حاصل ہو۔ میں نہیں کہتا کہ جہاد عمل صالح نہیں یا عبادت نہیں اس کا تو وہ درجہ ہے کہ وقتی طور پر وہ سب عبادتوں پر مقدم اور موجب اجر عظیم ہے۔ لیکن مقصود حقیقی بہر حال نہیں۔

۳ ——— عقلی دلیل

اگر امامت صالحہ کا قیام ہی دین کا مقصود حقیقی ہوتا تو کیا صرف مولانا مودودی صاحب ہی کے دماغ میں یہ بات آئی اور گزشتہ زائد از ہزار سال کے طویل زمانہ میں جتنے علماء، فضلاء مفسرین محدثین اور اولیاء اللہ گزرے ہیں۔ جن میں سے بہتوں کا مشغلہ ہی قرآن و احادیث کی چھان بین تعلیم و تعلم اور غور و فکر تھا۔ ان میں سے کسی کے دماغ کی رسائی اس مقصود اصلی تک نہ ہوئی؟ نیز اتنی اہم چیز کو اللہ تعالیٰ نے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کی طرح کھلے الفاظ میں دو چار بار کیوں نہ فرمائے

تعجب ہے۔ کہ نماز کا ذکر جس کی حیثیت مولانا کی نظر میں مقصودِ حقیقی کے ذریعہ یعنی جہاد کی ٹریننگ کے ایک جزو کی ہو۔ سات سو بار فرماویں اور خود اس مقصود کو ایسا مبہم اور غیر واضح رکھیں کہ ہم جیسے عامی تو کجا بڑے بڑے علماء سمجھانے سے بھی نہ سمجھ سکیں اور یقیناً یہ سمجھنا کہ یہ حضرات سمجھتے تو خوب ہیں۔ مگر مولانا مودودی کی مخالفت میں اس کو نہیں مانتے۔ محض سوءظنی ہے اور سوءظنی خصوصاً مخلصین کے متعلق قرآن کی رو سے بھی گناہ ہے۔

دلائل بالا سے بحمداللہ یہ بخوبی واضح ہوگیا کہ دین کا حقیقی مقصود امامت صالحہ کا قیام نہیں ہے۔ بلکہ عبدیت کے تقاضوں کی تکمیل کے ذریعے رضا و قربِ الٰہی کا حصول ہے۔ مگر مولانا یہ کہہ سکتے ہیں کہ بے شک بندوں کے لحاظ سے تو یہی مقصود ہے، میں کب اس کا انکاری ہوں میں تو دین کی وہ غرض و غایت بتلا رہا ہوں جو اللہ کے نزدیک ہے اور وہ یہ ہے کہ انتظام عالم درست رہے۔ فتنہ و فساد کو سر اٹھانے کا موقع نہ ملے جو اسی وقت ممکن ہے جب کہ اقتدار صالحین کے ہاتھوں میں ہو۔ اس منشا کے تحت وہ منتخب بندوں کی ایک جماعت وجود میں لائے۔ ارکانِ اربعہ کا ٹریننگ کورس مقرر کر کے اس کو جہاد فی سبیل اللہ کے قابل بنایا۔ پھر تبلیغ و جہاد ان پر فرض کر کے دنیا سے فساد مٹانے یعنی حکومت عادلہ قائم کرتے رہنے کا کام ان کے سپرد کر دیا۔ انہیں صفات کی بنا پر اس جماعت کو خیر الامم کے معزز لقب سے نوازا جیسا کہ —— كنتم خير أمة اخرجت للناس الخ سے ظاہر ہے۔ غرض دین کا حقیقی مقصود اللہ کی نظر میں بہرحال امامتِ صالحہ کا قیام ہی ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی ملازم کا مقصود تو اپنا کارِ منصبی بجا لانے سے تنخواہ کا حصول ہی ہوتا ہے مگر اس کے آقا کا مقصود اس ملازم کے کام سے کچھ اور ہوتا ہے جس کو بعض اوقات وہ ملازم جانتا بھی نہیں اور نہ اسے جاننے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یا جیسے بعض ناشرانِ کلام پاک اپنے یہاں کے مصحف میں غلطیاں نکالنے والے کو فی غلطی ایک اشرفی تک دینے کا اعلان کرتے ہیں اور دیتے بھی ہیں۔ ظاہر

لہ مولانا مودودی کے "انتباہ" سے بھی جو آگے آتے کچھ ایسا مترشح ہوتا ہے کیونکہ انہوں نے اپنی دعوت کے عدمِ قبول پر مسلم قوم کی پوزیشن یہودی قوم کی بتلائی ہے جن کے لئے آیا ہے کہ وہ حضور کو ایسا پہچانتے تھے جیسا اپنے بیٹوں کو، محض عناد کی وجہ سے آپ کی رسالت کے انکاری تھے۔

ہے کہ غلطی نکالنے والے تو اشرفیوں کے لالچ میں یہ کام بڑی لگن سے کریں گے مگر ناشر کا مقصد اس اعلان سے اپنے مصحف کو آئندہ ایڈیشن میں اغلاط سے قطعی مبرا کر کے چھاپنا ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی معاذ اللہ ہم کو ارکان اربعہ کے ذریعے جہاد کے لئے ٹرین (TRAIN) کرتے ہیں پھر جہاد کا حکم دیتے ہیں۔ ان احکام کی بجا آوری پر حسب وعدہ ہم کو جنت بھی دیں گے اور مقام قرب سے بھی نوازیں گے۔ مگر خود ان کا مقصود ان احکام یعنی مجموعہ دین سے اپنی زمین کو فساد سے پاک کرنا اور پاک رکھنا ہی ہے ——— بظاہر یہ بات جی کو خوب لگتی ہے کسی جہت سے بھی کوئی رخنہ متبادر نہیں ہوتا۔ بالکل چول سے چول بیٹھی نظر آتی ہے ——— غالباً اسی نظریہ کے تحت مولانا مدوح نے آیت ۱۴ سورہ صف میں ——— انصار اللہ ——— کا مطلب دوسرے مفسرین کی طرح "اللہ کے دین کے مددگار" کے بجائے خود "اللہ کے مددگار" لیا ہے اور دلیل یہ دی ہے کہ جو کام خدا کرنا چاہتا ہے اُس میں یہ بھی حصہ لیتے ہیں۔

ہمارے نزدیک امامت صالحہ کا قیام کمال ثبات فی الدین پر چلنے والا اللہ کی طرف سے ایک انعام تو ضرور کہا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ سورۂ نور کی آیت ۵۵ سے معلوم ہوتا ہے مگر اللہ کی نظر میں دین کا یہی مقصود ہونا محل کلام ہے۔ اور اگرچہ دلائل بالا ہیں تاہم ۶ بھی مولانا کے اس خیال کی تردید میں مع آخری "عقلی دلیل" کے حجت ہیں تاہم ہم دو ک دلائل بھی پیش کرتے ہیں اور ان چھ دلائل کے بعد آگے نمبر ۷ سے شروع کرتے ہیں۔

۷ ——— سورۂ نور آیت ۵۵ کا تفسیری ترجمہ ملاحظہ ہو ———

"تم میں جو لوگ ایمان لاویں اور نیک عمل کریں ان سے اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ ان کو زمین پر حکومت عطا فرماوے گا جیسا کہ ان سے پہلے (بنی اسرائیل وغیرہ) لوگوں کو حکومت دی تھی اور جس دین کو ان کے لئے پسند کیا ہے (یعنی اسلام) اس کو ان کے لئے قوت دے گا۔ اور (ان کو جو اس وقت دشمنوں سے طبعی خوف ہے) ان کے اس خوف کے بعد مبدل بالامن کر دیگا۔ بشرطیکہ میری عبادت کرتے رہیں (اور) میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔ اور جو شخص بعد (ظہور) اس (وعدہ) کے ناشکری کرے گا تو (ایسے شخص کے لئے وعدہ استخلاف نہیں کیوں کر)، یہ لوگ بے حکم ہیں۔"

یعنی مجموعہ ایمان و عمل صالحہ و عبادتِ خالصہ پر مجموعہ استخلاف و تمکین دین اور تبدیل خوف بالامن کا وعدہ ہے ـــــــ اب غور کرنے کی بات ہے کہ اگر دین یا مولانا کی اصطلاح میں جہاد مع اپنے ٹریننگ کورس کے استخلاف ہی کے لئے مشروع ہوا ہوتا تو اللہ تعالیٰ یوں کیوں نہ فرماتے کہ اگر تم دین پر پورے پورے چلے تو ہمارا مقصد حاصل ہو جائے گا[1] یعنی تم نظام کفر کو نظام حق سے بدلنے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ یہ کیا کہ مقصد تو ان کا حاصل ہو اور احسان ہم پر رکھیں نیز اس احسان یا انعام میں تمکین دین کا بالکل ہی تذکرہ نہ فرماتے جو بہر حال حصول مقصود کا ایک ذریعہ ہی ہے پس ظاہر ہے کہ استخلافِ مقصودِ حقیقی نہیں بلکہ کمال ثبات فی الدین پر ایک انعام ہے جس کا ایک بڑا فائدہ رفع فساد کے علاوہ تمکین دین بھی ہے۔ یعنی ایمان اعمال صالحہ اور اخلاص یا مجموعہ دین ہی مقصود بالذات ہے نہ کہ مقصود بالاستخلاف۔

۸ ـــــــ اگر یہی مقصود ہوتا تو اپنے عاشق بندوں کے دل میں اللہ تعالیٰ یہ بات ضرور ڈالتے تاکہ وہ اس مقصد کے لئے جد و جہد کرتے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر ایسے بندوں کی زندگیاں محض یاد الٰہی اپنی اور دوسروں کی اصلاح اخلاق میں گزر گئیں۔ نیز جن لوگوں نے پورے خلوص کے ساتھ اس مقصد کے لئے جد و جہد کی جیسے سید احمد شہید اور ان کی جماعت ان کو ان کے مشن میں ضرور کامیاب فرماتے۔ خصوصاً جب کہ وہ مولانا کی اصطلاح میں اللہ ہی کی مدد کے لئے کمر بستہ ہوئے تھے تاکہ دوسروں کو بھی اس کام کی طرف توجہ اور رغبت ہوتی۔ اگر اللہ تعالیٰ ایسا کر دیتے تو یقین غالب ہے کہ اس برصغیر کی تاریخ کا باب ہی پلٹ جاتا۔

۹ ـــــــ اگر دین سے یہی مقصود ہوتا تو جہاد کو تمام امم سابقہ پر فرض کیا جاتا۔ مگر جہاد بر اقدام بغرض قیام حکومتِ عادلہ کسی نبی سے ثابت نہیں اِلّا ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ یہ کیا کہ دین کا یہ مقصود آپ ہی کے زمانہ میں بن گیا اور اس سے قبل اللہ تعالیٰ کو معاذ اللہ اس

---

[1] یا اپنے مقصد کو پوشیدہ رکھ کر یوں فرماتے کہ "اگر تم نظام کفر کو نظامِ حق سے بدلو گے تو ہم تم میں کمال ثبات فی الدین کا ملکہ راسخ کر دیں گے تاکہ تم اپنے مقصود کو پہونچو" ـــــــ اس میں دونوں پہلوؤں کی رعایت ہو جاتی۔

طرف توجہ نہیں ہوئی۔ کیا پہلے زمانہ میں مفسدین کا وجود نہ تھا۔ یا اس فساد کی کوئی اہمیت اللہ تعالیٰ کی نظر میں نہ تھی۔ قرآن میں صرف دو قصے ایسے بیان ہوئے ہیں کہ ان سے جہاد کے وجوب پر کسی قدر استدلال کیا جاسکتا ہے۔ اول تو بنی اسرائیل کو عمالقہ پر جہاد کا حکم جس کی تعمیل سے بنی اسرائیل نے حضرت موسےٰ کی زندگی میں تو صاف انکار کر دیا تھا۔ پھر ایک مدت بعد جب عمالقہ نے بنی اسرائیل کا کچھ علاقہ زبردستی دبا لیا اور ان کے آدمیوں کو پکڑ لے گئے تب مجبوراً ان میں سے ایک جماعت نے جہاد کیا۔ سو یہ جہاد انتقامانہ تھا بلکہ اس کی قیام حکومت عادلہ نہ تھا ـــــــ دوسرا قصہ حضرت سلیمانؑ کا ملکہ بلقیس کو محض خوف جہاد کے ذریعہ مطیع کرنا۔ مگر اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے باوجود جنوں اور ہوا کو ان کے مسخر کئے جانے کے کافرانہ نظام ہائے حکومت کو مٹا کر حکومتِ عادلہ قائم کرتے رہنے کو اپنا مشن نہیں بنا رکھا تھا ورنہ وہ اس کوشش میں رہا کرتے کہ نظام ہائے کفر کے وجود کا علم حاصل کریں اگر وہ ایسا کرتے تو ملکہ صبا کی سلطنت کا علم ہُدہُد جیسے حقیر پرندے سے نہ ہوتا۔ اگر کوئی کہے کہ دوسرے انبیاء علیہم السلام نے بھی جہاد کر کے عادلہ حکومتیں قائم کی ہوں گی تو اول تو قرآن میں جہاد کو فرض فرماتے وقت روزوں کی طرح اس میں اس طرح فرماتے " ہم نے تم پر جہاد فرض کیا جیسے تم سے پہلی امتوں پر فرض کیا تھا۔ دوسرے انبیاء سابقین کے جہاد کے قصے بھی قرآن میں بیان ہوتے۔ جس سے کہ مسلمان اس کو گراں نہ سمجھتے جیسا کہ قرآن میں صحابہؓ کرام کا اس حکم کو گراں سمجھنے کا ذکر آیا ہے۔ آخر انبیاء و امم سابقہ کے قصے قرآن میں، کفار کی عبرت، حضورؐ کے اثباتِ نبوت اور آپؐ کے تسلیہ اور مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے ہی تو بیان ہوئے ہیں تو انہی مقاصد کے لئے اللہ تعالیٰ جہاد کے قصے بھی کیوں نہ بیان فرماتے جب کہ دین کا مقصود بقول مولانا یہی ہے۔ کم از کم حضرت سلیمانؑ کو اس چیز میں بوجہ اس کے کہ ان کے پاس بے پناہ طاقت تھی خصوصی سرگرمی دکھلانا چاہیئے تھی۔ وہ چاہتے تو روئے زمین پر کفر کا وجود ہی نہ رہتا اور ساری دنیا میں حکومت الٰہیہ قائم ہو جاتی جو ثابت نہیں۔

آیت ۱۴۶ تا ۱۴۸ سورۂ آل عمران سے بھی جہاد بغرض قیام حکومت الٰہیہ کا پتہ نہیں چلتا۔ یوں ظن و تخمین کے لئے تو ہمیشہ ہی گنجائش رہتی ہے۔

۱۰ ——— اگر امت مسلمہ کو وجود میں لانے اور انہیں ہدایت اور سچا دین قرآن اور اسلام دینے سے اللہ تعالیٰ کو مقصود اپنی دنیا کا انتظام ہی کرانا ہوتا تو چونکہ زائد از ہزار سال سے یہ امت جہاد کو چھوڑ بیٹھی ہے اور دنیا میں بحیثیت مجموعی غلبہ (سیاسی) اب کفر ہی کا ہو گیا ہے تو پھر معاذ اللہ اللہ تعالےٰ کا اپنے مقصد میں ناکام رہنا لازم آیا۔

آیت ۳۹ سورۂ توبہ میں جہاد کے لئے نہ نکلنے والوں اور آیت اخیرہ سورہ محمدؐ میں جہاد میں مال خرچ نہ کرنے والوں کو اللہ تعالےٰ نے دوسری ایسی قوم ان کی بجائے پیدا کرنے کی دھمکی دی ہے جو یہ دونوں کام کرے۔ مگر پیدا ہنوز نہیں کی جس سے ان کے اپنے مقصد کی تکمیل ہو جاتی۔ جب یہ دھمکی دی تھی تب تو خیر ضرورت نہیں پڑی تھی۔ صحابۂ کرام نے جان و مال سے جہاد میں خوب حصہ لیا۔ مگر جب سخت ضرورت لاحق ہوئی تب تو کر دیتے جو اقتدار رفتہ رفتہ کفار کے ہاتھ ہی میں نہ چلا جاتا ——— کیا اس سے صاف ظاہر نہیں ہوتا کہ اللہ تعالےٰ کو دین سے یہ مقصود ہی نہیں۔

اس جگہ ایک اور بات صاف کر دوں کہ جو لوگ بعض وقتی آیتوں کو اپنے حکم میں دوامی حیثیت کا حامل سمجھتے ہیں وہ ان دونوں آیتوں میں غور فرمائیں تو یہی سمجھنا پڑے گا کہ ان کے مخاطبین وہی حضرات تھے جن کے وقت میں یہ نازل ہوئیں۔ اسی طرح مسلمانوں کی اکثریت جن میں علماء کرام بھی شامل ہیں ——— انتم الاعلون ان کنتم مؤمنین ——— کا حکم بھی دائمی سمجھتی ہے۔ اور جب مسلمانوں کا غلبہ نہیں دیکھتی تو مجبوراً ان کے ایمان ہی کو غیر معتبر سمجھتی ہے۔ احقر کے نزدیک یہ صحیح نہیں ہاں معترض کا منہ بند کرنے کو یہ تاویل کی جا سکتی ہے کہ اس معیار کا ایمان نہیں جس پر ——— انتم الاعلون ——— کا ترتب ہو سکے۔

۱۱ ——— اگر دین کا حقیقی مقصود یہی ہوتا تو قرآن اور حدیث دونوں میں اس فرض کفایہ یعنی جہاد لغرض قیام امامت صالحہ کے تارکوں کو کافر قرار دیکر جنت سے محروم کر دیا جاتا کیونکہ وہ تو اس امت کا مقصد وجود ہی فوت کرتے ہیں۔ مگر جیسا کہ اوپر کے کثیر التعداد حوالوں سے ظاہر ہے ایسا نہیں کیا گیا۔ جنت کا وعدہ ایسے لوگوں سے بھی فرمایا ہے گو اس کے درجات عالیہ سے محرومی ہو۔

تعجب ہے کہ ایک وقت کی نماز بلا عذر قضا کرنے والے کو گو وہ اُسے بعد میں ادا بھی کر لے لاکھوں برس دوزخ میں رہنے کی وعید حدیث میں آئی ہے اور میں نے مولانا کی کسی تحریر میں ان کا اس کو صحیح سمجھنا بلکہ ایسے شخص کو اس سے زیادہ عذاب کا مستوجب قرار دینا پڑھا ہے۔ جب کہ نماز اس مقصود کے حصول کے ذریعہ کی حیثیت مولانا کے نزدیک رکھتی ہے۔ اور خود مقصود کو فوت کرنے والوں کو کافر کہا جائے یا کم از کم اس سے نصف عذاب دوزخ کی دھمکی بھی نہ دی جائے۔ نیز اگر دین سے یہی مقصود ہوتا تو ذکر اللہ تہجد صلوٰۃ التسبیح وغیرہ نفل عبادتوں کی بجائے ہتھیاروں کی ایجاد ورزشوں اور فوجی کرتبوں پر زیادہ ثواب کا لالچ دیا جاتا۔

۱۲ —— حضرت اسماعیلؑ کے بعد عرب میں تقریباً تین ہزار سال کی مدت میں کوئی نبی پیدا نہیں ہوا اور مولانا کے بقول حضورؐ کی بعثت سے قبل کم و بیش دو ہزار سال کے طویل زمانہ میں بے دینی اور فساد کا دور دورہ رہا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے مقصود حقیقی —— اخلاء الارض عن الفساد —— کا کوئی بندوبست کیوں نہ فرمایا۔ کم از کم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت ہی پر جہاد فرض کر دیتے تاکہ ان کے اور حضورؐ کے درمیان چھ سو سال ہی کے زمانہ میں فساد میں کمی آجاتی —— ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ خود ہی نظام ہائے کفر کو مٹانے کے درپے نہیں ہے۔ ان کے باقی رکھنے میں ویسی ہی کچھ حکمتیں ہوں گی جو شیطان اور شر کے خالق ہونے اور ان کے باقی رکھنے میں ہیں اور دین کو اپنی دنیا کا نظام درست رکھنے میں انہوں نے مشروع نہیں کیا ہے ؎

من نہ کردم خلق تا سودے کنم
بلکہ تا بر بندگاں جودے کنم

یہ دوسری بات ہے کہ دین سے یہ فائدہ بھی حاصل ہو جاوے۔ شرعی احکام سب ایسے ہی ہیں کہ ان پر عمل کرنے سے دنیوی فوائد بھی عموماً حاصل ہوتے ہیں۔ غلطی صرف یہ ہے کہ ان کو دنیوی اغراض کے لئے وضع شدہ سمجھیں۔

یہاں میں اُس اہم بات کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں جو میں نے ارکان اربعہ کے بیان کے بعد کہی تھی۔ یعنی اپنے جس فعل کی حکمت اللہ تعالیٰ نے خود نہ بتلائی ہو بندوں کو اس کی

تعیین کا حق نہیں پہنچتا۔ اس لئے مولانا مودودی کو اپنے وسیع علم اور اعلیٰ درجہ کی خداداد ذہانت کے باوجود دین کے مقصود کی تعیین نہ کرنی چاہیئے۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور جہاد کی جو حکمتیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمادی ہوں ہم کو صرف انہی کے بیان کرنے کا حق ہے۔ اگر اتفاق سے کبھی کوئی چیز ذہن میں آبھی جائے تو اسس کو ظن وتخمین کے درجہ سے نہ بڑھانا چاہیئے اور دوسروں کے سامنے اس کا اظہار بھی ایسے طریقہ سے کرنا چاہیئے کہ وہ بھی اسے ایسا ہی سمجھیں۔ اول تو احکام شرعیہ کی علتیں اور حکمتیں تلاش کرنا ہی نامناسب ہے۔ ہمارا مذہب تو یہ ہونا چاہیئے ؎

زباں تازہ کردن باقرارِ تو
نہ انگیختن علت از کار تو

اور اگر کوئی حکمت سمجھ میں آبھی جائے تو اسی کو مدارِ حکم سمجھ لینا نہایت خطرناک ہے۔ احقر نے ارکانِ اربعہ کے بیان میں کہا ہے، کہ بعض لوگ نماز کی حکمت اتحاد و اتفاق بتلاتے ہیں۔ پھر یہ بھی عرض کیا تھا کہ اگر یہی وجہ نماز کے مشروع ہونے کی ہے تو بعض لوگ کہہ سکتے ہیں کہ پھر اس چیز کے لئے مسجد میں آنا۔ وضو کرنا۔ جماعت کے انتظار میں وقت خرچ کرنا اور مسجد کی چٹائیوں پر اپنے کپڑے میلے کرنا کیا ضروری ہے۔ ہم کلب میں تفریح کے لئے جمع ہو کر اتفاق و اتحاد حاصل کر سکتے ہیں ——— تو حکمتیں تراشنے کا یہ بُرا اثر ہوتا ہے کہ لوگ اسی چیز کو مدارِ حکم سمجھ کر اگر کسی دوسرے طریقہ سے وہ چیز حاصل ہو سکے تو وہ اس حکم شرعی پر عمل کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔

چنانچہ وضو کی حکمت بعض کے نزدیک نظافت ہے۔ اس پر ترقی یافتہ طبقہ کے بعض بے باک افراد کہتے ہیں کہ عرب کے بدو جنگل میں پھرا کرتے تھے، ان کے چہرے اور ہاتھ گرد آلود رہتے تھے بعض اوقات اونٹ کے یا اپنے ہی پیشاب کی چھینٹیں پیروں پر پڑ جاتی تھیں اس لئے وضو میں انہیں کھلے رہنے والے اعضاء کو دھونے کا حکم ہوا۔ ہم لوگ کوٹھی بنگلوں میں رہتے ہیں جن میں گرد و غبار کا گزر نہیں، نیز موزے دستانے پہنتے ہیں پھر ہمیں وضو کی کیا ضرورت ہے؟ ——— پس جو شخص نظافت ظاہری ہی کو وضو کے حکم کی علت سمجھتا ہو وہ وضو ہی کو چھوڑ دے گا۔ کیونکہ بزعم خود اسے نظافت حاصل ہے۔

نماز کے متعلق بعض کو کہتے سُنا کہ پہلے زمانہ کے لوگ تعلیم کی کمی کی وجہ سے بڑے اکھڑ متکبر اور غیر مہذب ہوتے تھے، اس لئے نماز رکھی گئی تاکہ جھکنے اور ناک رگڑنے سے ان میں انکساری اور نرمی

پیدا ہو۔ ہم میں تعلیم کی وجہ سے تہذیب آگئی ہے ہمیں ان افعال کی مشق سے کیا فائدہ خدا کو اس کی ضرورت ہے نہیں —— چلیے نماز سے بھی چھٹی پالی۔

اسی طرح —— روزہ کو کسر قوت بہیمیہ کا ذریعہ سمجھا اور اپنے ضعف کے عذر سے اس کو بھی بیکار سمجھ لیا۔

زکواۃ کے متعلق میں نے خود ایک بڑے عالم کو یہ کہتے سنا کہ زکواۃ تو حق ہے مگر صاحب نصاب ہونے کا جو معیار مقرر کر دیا گیا ہے وہ ہر زمانہ کے لیے صحیح نہیں —— غرض یہ علت نکالنے کا مرض نہایت خطرناک اور شریعت کی ساری عمارت کو منہدم کرنے والا ہے۔ کیونکہ اپنی یا دوسروں کی اختراعی حکمتوں کو مدارِ حکم سمجھنے والے اعمال شرعیہ سے دست برداری حاصل کر سکتے ہیں اور اگر نہ بھی کریں تو ہرگز ان افعال کو دلی رغبت سے انجام نہیں دے سکتے جس کی ضرورت ہوتی ہے۔

مولانا مودودی نے بھی دین کی جو حکمت بیان فرمائی ہے۔ اور جن لوگوں کی سمجھ میں وہ بیٹھ گئی ہے ان سے رفتہ رفتہ انابت، اجتناب، اخلاص، تواضع اور ادب وغیرہ اخلاق حمیدہ جو عبدیت پر متفرع ہونے چاہئیں کم ہوتے جا رہے ہیں۔ ابھی جماعت اسلامی نئی ہے اور جو لوگ اس میں شامل ہوئے تھے۔ وہ بہر حال بزرگوں کے اثرات لاشعوری طور پر اپنے اندر رکھتے تھے ان پر زیادہ اثر ظاہر نہیں ہوا مگر ان کی گودوں میں پلنے والی آئندہ نسلیں خالص جماعتی تصورات کی حامل ہوں گی۔ میں نے ان بچوں میں یہ چیز مشاہدہ کی ہے کہ وہ ابھی سے نمازوں میں سنن غیر مؤکدہ اور نفل شاذ ہی پڑھتے ہیں۔

جماعت اسلامی دین کو بہترین نظام حیات کی حیثیت سے دیکھتی ہے اور دوسروں پر پیش کرتی ہے۔ اس نے دین کے تعبدی پہلو کو دبا دیا ہے نیز جماعت کے افراد میں خود پسندی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ صرف اپنی ہی جماعت کو حق پر سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال سے وہی اصلی مسلمان ہیں باقی سب نسلی مسلمان ہیں۔ ان کے سوا دوسرے دین کو سرے ہی سے نہیں سمجھتے۔

جماعت کے ایک دیرینہ رکن نے ایک بار مجھ سے دریافت کیا کہ تمہارے خیال میں حضور کی ہجرت کی کیا وجہ تھی۔ میں نے کہا کہ میں تو صرف یہی وجہ جانتا ہوں کہ مکہ میں لوگ ان کے جانی دشمن ہو گئے تھے اور ان کا کام تبلیغ کا آسانی سے نہیں چلنے دیتے تھے، انہوں نے اس پر یہ فرمایا کہ اگر تم یہ نہیں مانتے کہ ہجرت سے حضور کا منشاء ایک حکومت کا قیام تھا تو تمہارے ایمان میں فرق ہے۔

بھلا ایسی چیزیں بھی ایمان کے لوازمات ہوسکتی ہیں؟ —— غرض ان کا خیال ہے کہ دین کے اسرار ان کے سوا کوئی نہیں سمجھتا۔ اسلامی نہج پر ان کے علاوہ کوئی جماعت کام نہیں کرتی، چونکہ انہی تصورات کے تحت مولانا مودودی نے جماعت کی بنیاد رکھی تھی اس لئے یہ اثرات ناگزیر بھی ہیں۔

یہاں مولانا کے چند جملے جو انہوں نے اپنی دعوت اور اس پر لبیک نہ کہنے والوں کے متعلق بطور "انتباہ" فرمائے ہیں نقل کر دینا بے محل نہ ہوگا۔

" اس موقعہ پر میں ایک بات نہایت صفائی کے ساتھ کہدینا چاہتا ہوں کہ اس قسم کی ایک دعوت کا جیسی کہ ہماری یہ دعوت ہے کسی مسلمان قوم کے اندر اٹھنا اس کو ایک بڑی سخت آزمائش میں ڈال دیتا ہے۔ جب تک کہ حق کے بعض منتشر اجزاء باطل کی آمیزش کیساتھ سامنے آتے رہیں۔ ایک مسلمان قوم کے لئے ان کو قبول نہ کرنے اور ان کا ساتھ نہ دینے کا ایک معقول سبب موجود رہتا ہے۔ اور اس کا عذر قبول ہوتا رہتا ہے۔ مگر جب پورا حق بے نقاب ہو کر اپنی خالص صورت میں سامنے رکھ دیا جائے اور اس کی طرف اسلام کا دعویٰ رکھنے والی قوم کو دعوت دی جائے تو اس کے لئے ناگزیر ہو جاتا ہے کہ یا تو اس کا ساتھ دے اور اس خدمت کو انجام دینے کے لئے اٹھ کھڑی ہو جو امت مسلمہ کی پیدائش کی ایک ہی غرض ہے یا نہیں تو اسے رد کر کے وہی پوزیشن اختیار کرلے جو اس سے پہلے یہودی قوم اختیار کر چکی ہے۔......... غیر مسلم اقوام کا معاملہ اس سے مختلف ہے لیکن اگر مسلمان منہ کو موڑیں اور اپنے مقصد وجود کی طرف صریح دعوت کو سن کر الٹے پاؤں پھر جائیں تو یہ وہ جرم ہے جس پر خدا نے کسی نبی کی امت

لہ یعنی ذلت، پستی اور قیامت کے لئے حکومت سے محرومی، اگر مسلمانوں کو پاکستان مل جانا مولانا کی امت مسلمہ کے حق میں اس انتہائی بددعا اور کوسنے کی نامقبولیت کا کھلا ثبوت ہے۔ جو اللہ تعالےٰ نے فوراً دیدیا۔

کو معاف نہیں کیا ہے۔

ایک طرف ہماری یہ دعوت ہے جو مسلمانوں کو ٹھیک اس کام کے لئے بلا رہی ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ نے مسلم جماعت کی تاسیس و تشکیل کی واحد غرض قرار دیا ہے اور دوسری طرف وہ دعوتیں ہیں جن کے پیشِ نظر مسلمانوں کے دنیوی مفاد کی خدمت کے سوا کچھ نہیں ہے ان دو متقابل پکاروں میں سے دوسری پکار کی طرف مسلمانوں کا فوج در فوج لپکنا اور پہلی پکار کو امت کی عظیم اکثریت کا بہرے کانوں سے سننا اکابرِ ملت اور علماء و مشائخ کا اس سے بے اعتنائی برتنا، اس کی کھلی یا چھپی مخالفت پر اُتر آنا۔ اور ایک گروہ قلیل کا اس کی طرف بڑھنا بھی تو رکتے اور جھجکتے اور پس و پیش کرتے ہوئے بڑھنا میرے نزدیک ایک نہایت بُری علامت ہے۔ اور ایک عظیم خطرہ ہے۔ جس میں یہ مسلمان قوم اپنے آپ کو ڈال رہی ہے :

(ماخوذ از روداد دوم جماعت اسلامی)

یہ "انتباہ" اور اس سے قبل والی تقریر بالا جماعت اسلامی پر مولانا مودودی کے خیالات کے اثرات کے سلسلہ میں بطور جملۂ معترضہ درمیان میں آگئی تھی۔ مجھے کہنا یہ تھا کہ دلائل مذکورہ کی روشنی میں اول تو دین کا مقصود اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی نظام ہائے کو امامت صالحہ سے بدلتے رہنا نہیں معلوم ہوتا ——— اور بفرض محال اگر ہو تو بھی تو جب انہوں نے خود اس کو نہیں تبلایا تو ہمیں اس کے تعین کا کیا حق اور ہمیں اس سے کیا بحث ؟ ہمیں تو اپنے نقطۂ نظر سے ہی جو کتاب اللہ اور احادیثِ رسول سے واضح ہے۔ دین پر عمل کر کے رضا و قرب الٰہی اور حصول مغفرت اور جنت ہی کو اپنا نصب العین بنانا چاہیئے اور اللہ تعالیٰ کے افعال کی حکمتیں تلاش کر کے اپنے منصب سے نہیں بڑھنا چاہئے ——— "ایاز قدر خود بشناس" اور حدیثِ مطرب دمے گو در از دہر کمتر جو" کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔

کیا دین و ایمان کا یہی تقاضہ ہے کہ تبلیغ کے ذریعہ ایک جتھا بنا کر اجتماعی قوت سے نظام کو بدلنے کی مسلسل سعی جاری رکھی جاوے ؟ اور کیا یہی کتاب الٰہی کا مطالبہ اور انبیاء علیہم السلام کی یہی سنت ہے ، ؟

دین کا یہ تقاضا تو بے شک ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ بہترین طریقہ پر اس کی تبلیغ کی جاوے۔ لیکن ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ نظام ہائے کفر کو بدلنے یا بدلتے رہنے کے لئے جتھا بنانا ہمیشہ ضروری اور مفید بھی ہے۔ یقیناً ایسا جتھا جو تہتا ہو کسی حکومتِ قاہرہ کے مقابلہ میں قوت سے ہرگز غالب نہیں آسکتا۔ اگر آ دے بھی تو جیسا کہ انقلاب روس سے کوئی استدلال پکڑے ۔ تو جو ظلم اور خونریزیاں وہاں ہوئیں ان کا مرتکب ہونا پڑے گا۔ جس کی شرعاً کبھی اجازت نہیں ہو سکتی۔ پس پُرامن طریقہ پر موثر تبلیغ ہی کافی ہے ! اس سے زیادہ کے ہم مکلف نہیں اگر اکثریت کے اذہان خدا نے ہماری تبلیغ سے بدل دیئے تو نظام کفر خود ہی نظام اسلامی کے لئے جگہ خالی کر دے گا۔ لیکن اگر اذہان بدلنے سے قبل کسی طرح نظام حق قائم بھی کر دیا گیا تو اول تو وہ دیرپا نہ ہوگا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی مثال موجود ہے ۔ اگر دیرپا ہوا بھی تو چنداں مفید ثابت نہ ہوگا۔ رنجش کی بنا پر چوری کا الزام لگا کر جھوٹی گواہیاں دی جائیں گی اور عدالت ان کے ہاتھ کٹوانے پر مجبور ہوگی - اللہ تعالیٰ نے مثالی اسلامی حکومت میں بھی قمار ، خمر ، سود اور متعہ کو ایک دم نہیں مٹا دیا تھا بلکہ ایک عرصہ دراز کی تبلیغ اور صحبت رسول ؐ جیسی بابرکت تربیت دینے کے بعد پورے اسلامی قوانین کا نفاذ کرایا تھا۔

شاید کوئی کہے کہ شاہ عبدالعزیز نے عرب میں ایک دم ہی اسلامی قوانین کا نفاذ کر دیا تھا اور انہیں اس میں کامیابی بھی ہوئی تو اس سے استدلال پکڑنا صحیح نہیں ، عرب جیسے حالات ہر جگہ میسر نہیں آسکتے۔

غرض دین کا منشاء ایک منظم ، موثر اور دوامی تبلیغ تو ضرور ہے مگر جتھا بنا کر کسی باضابطہ حکومت کا مقابلہ کرنا اپنے آپ کو بلا وجہ ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے بھی شرائط ہیں

خصوصاً نہی عن المنکر کے لئے تو استطاعت کی قید ہے اور اپنے سے دگنی تعداد تک رکھنے والے کفار کے مقابلہ میں جہاد کا وجوب ہے اور اس سے زاید کے مقابلہ میں ساقط ہو جاتا ہے اور آجکل تو آدمیوں کی تعداد کوئی خاص اہمیت ہی نہیں رکھتی، اب تو طاقت کا دار و مدار اسلحہ کی عمدگی اور مقدار پر ہے۔ چنانچہ دس کروڑ مسلمان محض پچیس لاکھ اسرائیلیوں سے اسی بنا پر عاجز ہیں۔ اسلامی حکومت کے لئے کوشاں مصر میں اخوان المسلمین کے بہت منظم جتھے کا جو حشر ہوا سب کو معلوم ہے۔ خود مولانا مودودی نے جو جتھا آج سے چھتیس سال قبل اسی غرض سے بنایا تھا۔ وہ کسی غیر مسلم حکومت مثلاً ہندوستان کا نظام حکومت تو خیر کیا پلٹتا خود مسلمانوں کے ملک اور حکومت پاکستان میں اُسے اس طویل عرصہ میں جو کامیابی ہوئی ہے مولانا اُسے ناپ کر دیکھیں کرتی نہ ہے۔ جب کہ دوسرے اسلام پسند جتھے بھی اس کام میں ان کے ہمنوا اور کوشاں ہیں۔

میں اوپر کہیں عرض کر چکا ہوں کہ مسلمان حکومت کے باشندوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے ملک میں اسلامی حکومت قائم کرنے کی ضرور کوشش کریں۔ مگر اس مقصد کے لئے ایک سیاسی جماعت بنانا صحیح نہیں۔ ساری کوشش آبادی کا ذہن بدلنے میں صرف کرنا چاہیئے۔ جس کا ذریعہ موثر تبلیغ کے سوا کچھ نہیں سیاسی جماعت سے تو لوگ یہی اندازہ لگاتے ہیں کہ یہ لوگ مذہب کی آڑ میں اپنی اقتدار کی بھوک مٹانا چاہتے ہیں۔

رہا اس جتھا سازی کو کتاب الٰہی کا مطالبہ بتلانا تو یہ بات حقیقت سے دور کا لگاؤ بھی نہیں رکھتی اور ہم ہر اس شخص کو جو ایسا سمجھے چیلنج کرتے ہیں کہ وہ کتاب الٰہی سے ثابت کرے کہ اگر روئے زمین پر صرف ایک ہی مومن ہو۔ اس کا بھی فرض ہے کہ وہ تبلیغ کے ذریعے ایک جتھا بنا کر اپنی اجتماعی قوت سے نظام کفر کو نظام اسلامی سے بدلنے کی کوشش کرتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی مثال دینا غلط ہے۔ کیونکہ اول تو ان پر تبلیغ فرض ہوتی ہے۔ دوسرے ہم ابھی ثابت کریں گے کہ انہوں نے بھی کسی حکومت قاہرہ کے مقابلہ میں یہ کام نہیں کیا۔

آیت ۷۵،۷۶،۷۷ سورہ نساء سے معلوم ہوتا ہے کہ جو مسلمان ہجرت کر کے مدینہ منورہ نہیں جا سکے تھے ان کو کفار کے پنجے سے چھڑانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جہاد پر رغبت دلائی ہے۔ مگر خود ان ضعفاء پر جتھا بنا کر حکومت بنانے یا اقتدار حاصل کرنے کا ذرہ برابر

وجوب نہیں ٹھہرایا نہ خود انہوں نے ایسا کیا۔ آجکل تبلیغی جماعت کی کوشش سے یوروپ، امریکہ یا جاپان میں جو تھوڑے آدمی مسلمان ہو گئے ہیں وہ اگر حکومت بدلنے کے لئے جتھا بنانے لگیں تو یہ ان کی حماقت اور اقدام خودکشی اور تبلیغ پر پابندی کا باعث ہوگا ——— ان کا فرض اتنا ہی ہے کہ اگر وہ ان ممالک میں اپنا دین محفوظ نہ سمجھیں تو اگر ممکن ہو تو کسی مسلمانوں کے ملک میں ہجرت کر جائیں اور اگر ممکن نہ ہو تو وہیں رہ کر جتنے دین پر عمل کر سکیں کرتے رہیں۔

آیت ۱۰۹، ۱۱۰ سورۃ بقر کے مطابق یہی ان کا پورا دین شمار ہو کر ثواب میں اس کے برابر ہوگا۔ البتہ وہ پرامن تبلیغ ضرور کرتے رہیں۔ اس سے زیادہ ان پر کچھ واجب نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہرگز یہ نہیں چاہتے کہ لوگ اسلام لاکر قربانی کے بکرے بن جائیں۔ اور مولانا کی یہ جتھا سازی کی تعلیم اس مثل کے مصداق ہے کہ

"چڑھ جا بچہ سولی پر بھلی کریں گے رام"

اب ہم انبیاء کرام کی سنت پر بھی جو اس معاملہ میں رہی ہو ـ لگے ہاتھوں غور کر لیں۔ سو باوجود کوشش کے ہمیں کسی نبی کی ایسی مثال نہیں ملی جس نے باقاعدہ کسی کافر حکومت کو جتھا بنا کر اجتماعی کوشش سے بدل دیا ہو ——— دیکھئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو زیادہ تر پیغمبروں کے جد اعلیٰ ہیں نمرود کی سلطنت سے ہجرت تو کی مگر اس کی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش نہیں کی جب کہ اس نے ان کو آگ میں بھی ڈلوایا تھا۔ مطلب یہ کہ انتقاماً بھی اس سے لڑنا درست تھا۔ پھر مصر میں فرعون کی حکومت کے خلاف بھی مولانا مودودی کی رائے پر عمل نہیں کیا گیا۔ بلکہ ان دونوں ملکوں میں تبلیغ عام کو بھی بخیال احقر مناسب نہیں سمجھا۔ آپ کے بھتیجے حضرت لوطؑ اور بیٹے حضرت اسماعیلؑ و اسحاقؑ اور پوتے حضرت یعقوب علیہ السلام سے بھی کسی حکومت کے قیام کی سعی منقول نہیں یہ حضرات بھی محض تبلیغ ہی کرتے تھے اور بس۔

پھر حضرت یوسفؑ نے مصر کے اقتدار پر عرصہ تک قابض رہنے کے باوجود دوسری جگہ تو کجا خود مصر میں بھی حکومتِ الٰہیہ قائم نہیں فرمائی۔ ان کے زمانہ میں بھی قانون فرعون ہی کا چلتا تھا۔ اور ان کے انتقال کے بعد حکومت پھر فرعون ہی کے خاندان میں منتقل ہوئی۔ پھر حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ ایک مدت دراز تک فرعون کی حکومت میں اپنے لاکھوں افراد پر مشتمل بنی اسرائیل کے جتھے اور اپنے

وجوب نہیں ٹھہرایا، خود انہوں نے ایسا کیا۔ آجکل تبلیغی جماعت کی کوشش سے یورپ، امریکہ یا جاپان میں جو تھوڑے آدمی مسلمان ہو گئے ہیں وہ اگر حکومت بدلنے کے لئے جتھا بنانے لگیں تو یہ ان کی حماقت اور اقدام خودکشی اور تبلیغ پر پابندی کا باعث ہو گا ——— ان کا فرض اتنا ہی ہے کہ اگر وہ ان ممالک میں اپنا دین محفوظ نہ سمجھیں تو اگر ممکن ہو تو کسی مسلمانوں کے ملک میں ہجرت کر جائیں اور اگر ممکن نہ ہو تو وہیں رہ کر جتنے دین پر عمل کر سکیں کرتے رہیں۔

آیت ۱۰۹، ۱۱۰ سورۂ بقرہ کے مطابق یہی ان کا پورا دین شمار ہو کر ثواب میں اس کے برابر ہو گا۔ البتہ وہ پُرامن تبلیغ ضرور کرتے رہیں۔ اس سے زیادہ ان پر کچھ واجب نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہرگز یہ نہیں چاہتے کہ لوگ اسلام لا کر قربانی کے بکرے بن جائیں۔ اور مولانا کی یہ جتھا سازی کی تعلیم اس مثل کے مصداق ہے کہ

"چڑھ جا بچہ سولی پر بھلی کریں گے رام"

اب ہم انبیاء کرام کی سنت پر بھی جو اس معاملہ میں رہی ہو۔ لگے ہاتھوں غور کر لیں۔ سو باوجود کوشش کے بھی کسی نبی کی ایسی مثال نہیں ملتی جس نے باقاعدہ کسی کافر حکومت کو جتھا بنا کر اجتماعی کوشش سے بدل دیا ہو ——— دیکھئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو زیادہ تر پیغمبروں کے جد اعلیٰ ہیں نمرود کی سلطنت سے ہجرت تو کی مگر اس کی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش نہیں کی جب کہ اس نے ان کو آگ میں بھی ڈلوایا تھا۔ مطلب یہ کہ انتقاماً بھی اس سے لڑنا درست تھا۔ پھر مصر میں فرعون کی حکومت کے خلاف بھی مولانا مودودی کی رائے پر عمل نہیں کیا گیا۔ بلکہ ان دونوں ملکوں میں تبلیغ عام کو بھی بخیال احقر مناسب نہیں سمجھا۔ آپ کے بھتیجے حضرت لوطؑ اور بیٹے حضرت اسماعیلؑ و اسحاقؑ اور پوتے حضرت یعقوب علیہ السلام سے بھی کسی حکومت کے قیام کی سعی منقول نہیں یہ حضرات بھی محض تبلیغ ہی کرتے تھے اور بس۔

پھر حضرت یوسفؑ نے مصر کے اقتدار پر عرصہ تک قابض رہنے کے باوجود دوسری جگہ تو کجا خود مصر میں بھی حکومتِ الٰہیہ قائم نہیں فرمائی۔ ان کے زمانہ میں بھی قانون فرعون ہی کا چلتا تھا۔ اور ان کے انتقال کے بعد حکومت پھر فرعون ہی کے خاندان میں منتقل ہوئی۔ پھر حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ ایک مدت دراز تک فرعون کی حکومت میں اپنے لاکھوں افراد پر مشتمل بنی اسرائیل کے جتھے اور اپنے

نہ عقل کا اور نہ کتاب اللہ کا یہ مطالبہ ہے اور نہ سنتِ انبیاء علیہم السلام ہے۔

میں یہاں ایک اور بات عرض کر دوں کہ انبیاء علیہم السلام کا کارِ منصبی ہمیشہ تبلیغ ہی رہا ہے نہ کہ سلطنت بنانا جو کہ تبلیغ کے مقابلہ میں ادنیٰ درجہ کی چیز ہے۔ چنانچہ ہر پیغمبر نے یہی کہا ہے کہ میں تبلیغ پر تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا میرا اجر اللہ پہ ہے۔ جو یقیناً حکومت جیسی حقیر چیز نہیں۔

تاریخ بتلاتی ہے کہ بنی اسرائیل میں عموماً یہی طریقہ رہا کہ نبی کی موجودگی میں بادشاہ الگ ہوتا تھا۔ البتہ چند پیغمبروں میں دونوں شانیں رہیں۔ جیسے حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام یا ہمارے حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم نیز کسی نبی نے بھی جماعت اسلامی کی طرح اپنا کام اس نعرے کیساتھ شروع نہیں کیا کہ میرا نصب العین ایک حکومت عادلہ کا قیام ہے۔ اور احقر کے خیال سے نہ تو یہ چیز قرآن سے ثابت ہے اور نہ حضورؐ کا عزم ہی شروع سے حکومت قائم کرنیکا تھا، ہاں حضورؐ یہ ضرور سمجھتے تھے کہ تبلیغ کے نتیجہ میں ایک حکومت بن سکتی ہے۔

حضرت ابوطالب کے مکان پر کفار سے کلمہ طیبہ کہنے کا مطالبہ کرتے وقت حضورؐ کا یہ فرمانا بھی کہ اس کے کہنے سے عرب تمہارا تابع ہو جائیگا اور عجم تمہیں خراج دیگا ہرگز یہ ظاہر نہیں کرتا کہ آپؐ کا عزم ہی ایک حکومت بنانے کا تھا۔ بلکہ محض اس کے بن جانے کو ممکن سمجھنا ہے۔ دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے۔ ——— اگر خدانخواستہ حضورؐ اپنا کام اس نعرہ کیساتھ شروع فرماتے تو لوگ آپؐ کی رسالت پر ایمان لانے میں جھجکتے اور یہ سوچتے کہ کہیں آپؐ رسالت کی آڑ میں حکومت ہی کے تو طالب نہیں ہیں؟ رہا یہ کہ پھر آپؐ نے حکومت قائم کیوں کی تو ہمارا خیال تو یہ ہے کہ رسول کے تمام افعال اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت انجام پاتے ہیں۔ پس حکومت قائم کرانا بھی چونکہ اللہ کو منظور تھا اس لئے اس نے اپنے رسول کو اسی ارادہ کے مطابق ہدایات دیں۔ اور یہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ یہ چیز ضروری بھی تھی۔ دو وجہوں سے ایک تو محافظت و مدافعت اسلام کے لئے اور دوسرا اسلام کے باب سیاسیات کی تکمیل کے لئے ——— باقی ہم یہ ماننے کو تیار نہیں کہ شروع ہی سے حکومت کا قیام آپؐ کا نصب العین تھا۔ آپؐ کا نصب العین تو تبلیغ کے ذریعہ بندوں کو خدا سے ملانا ہی تھا۔ اور حکومت تو اس پر متفرع ہونے والی ضمنی چیز (BY PRODUCT) کے بطور تھی۔ بشرطیکہ تبلیغ میں مزاحمت نہ ہوتی جس کو قتال کے ذریعے دور کیا گیا۔

شاید مولانا یا اور کوئی ذہین شخص آیت ـــــ ھُوَالذی ارسل رسولہ الخ ـــــ کو قیام حکومت کے نعرہ کا قائم مقام تبلائے تو ہم اس آیت پر کافی بحث کر چکے ہیں کہ اس میں غلبہ سیاسی مراد نہیں بلکہ دینی غلبہ مراد ہے۔ اور جو ہمارے استدلالات سے کسی طرح مطمئن نہ ہو اور غلبہ سیاسی ہی مراد لے اُسے سوچنا چاہیئے کہ اس آیت کا نزول بعثت نبوی سے کم از کم اٹھارہ سال بعد ہوا۔ جب حکومت بالفعل کسی حد تک قائم ہو چکی تھی۔ یا کم از کم مسلمانوں میں حکومت قائم کرنے کی طاقت پیدا ہو چکی تھی ـــــ آج کوئی جتھا جو طاقت کے لحاظ سے حکومت کے مقابلہ میں صفر کا درجہ رکھ کر اپنا نصب العین قیام امامتِ صالحہ تبلائے تو وہ کر تو کچھ نہ سکے گا البتہ اقتدار کی نظر میں معتوب ضرور ہو جائے گا۔ حکومت جب چاہے حفاظت خود اختیاری کی آڑ لیکر اسے جیل میں رکھ دیا کرے گی۔ یہ فرضی باتیں بلکہ عملی ہیں۔ ہندوستان کی جماعت اسلامی کو اس کا خصوصی تجربہ ہے، اور یہ چیز میں اس مضمون میں بڑی تفصیل سے بیان کر چکا ہوں کہ جہاد کے ذریعے نظام حق کے کفر کو بدلنا نہ تو ممکن ہے نہ مناسب ہے، نہ اس کی ضرورت ہے بلکہ یہ فرض کفایہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ ـــــ اب تو یہ تبدیلی موثر تبلیغ کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ جس قدر بھی حاصل ہو سکے۔

ایک ضروری چیز جماعت اسلامی کی خدمت میں یہ بھی عرض کرنا ہے کہ غیر مسلموں پر اسلام کو ایک بہترین نظام حیات کے طور پر پیش کرنا تبلیغ میں مفید نہیں ہے کیونکہ اگر مقابل ذہین اور استدلالی قوت رکھنے والا ہوا تو وہ اپنے نظام حیات کو اسلامی نظام حیات سے بہتر ثابت کرنے کی کوشش کرے گا ـــــ اور ضروری نہیں کہ وہ اس کی افضلیت کا قائل ہو ہی جائے ـــــ نیز یہ کوئی ایسی اہم چیز نہیں جس کے لئے کوئی اپنا دین بدلے۔ زندگی معمولی فرق سے سبھی نظام ہائے حیات میں گزر جاتی ہے۔ لوگ ہزاروں سال سے جن نظام ہائے حیات کے تحت زندگیاں گزار رہے ہیں۔ ان ہی کے عادی ہو گئے ہیں اور عموماً کوئی دقت ان میں محسوس نہیں کرتے، بس اسلام کو غیر مسلموں پر پیش کرتے وقت صرف توحید و رسالت پر دلائل قائم کرنے چاہیئیں۔ اصول مان لینے کے بعد فروعات کا منوانا بہت آسان ہے۔

آخر میں ـــــ مولانا ممدوح سے خصوصاً اور جماعت اسلامی والوں اور اس میں شرکت کا ارادہ رکھنے والے حضرات سے عموماً گزارش کروں گا کہ وہ میرے اس مضمون پر کھلے

اور ٹھنڈے دل سے غور فرمادیں اور اس مضر تعبیر دین کے ختم کردینے یا باقی رکھنے کا سنجیدگی سے فیصلہ فرمادیں ۔
ارکانِ اربعہ کو جہاد کا ٹریننگ کورس سمجھنے کے مضر اثرات میں بیان کر چکا ہوں ، اب میں اس بنیادی نظریہ یعنی ——— " دین کا حقیقی مقصود امامت صالحہ کا قیام ہے " ——— کے متعلق عرض کرتا ہوں کہ اگر دنیا کی غیر اسلامی حکومتیں مولانا مودودی کے نظریات کو صحیح اسلام سمجھ لیں تو وہ اسلام کے قریب بھی نہ پھٹکیں اور اس سے محض اس وجہ سے نفرت کریں کہ اس دین کا مقصد ہی جملہ غیر اسلامی حکومتوں کو ختم کرنا ہے ایسی صورت میں ان کی مسلمانوں اور ان کی حکومتوں کو کچلنے کی تمام کوششیں حق بجانب ہوں گی ۔ بلا شبہ ایسی تعلیم جو اسلام کے خلاف لوگوں میں نفرت کا جذبہ پیدا کرے ۔ ہرگز قرآن کی تعلیم نہیں ہو سکتی ۔

پس خدارا دین کا مقصود امامت صالحہ کا قیام نہ تو خود سمجھئے اور نہ دوسروں کے کانوں میں یہ غلط چیز ڈالیے ، ورنہ آپ لوگوں کو اللہ کے دین سے متنفر کرنے والوں میں شمار ہوں گے ۔ اگر آپ کی سمجھ میں یہ بات آتی ہو تو پھر ہمت کر کے سید سلیمان ندوی کی طرح اپنی غلطی کا اعلان فرما دیجئے اور جماعت اسلامی کو دوسرے طریقہ پر منظم فرما کر ——— ولتکن منکم الخ ——— کے منشاء کی تکمیل فرمائیے ۔

احقر کا خیال ہے کہ مولانا الیاس کاندھلوی کی تبلیغی جماعت باوجود اپنے بے انتہا مفید ہونے کے قرآنی منشاء کے مطابق نہیں ہے اور جماعت اسلامی باوجود اس کے کہ اس نے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو الحاد سے روکا ہے نیز اردو میں ایک جاندار لٹریچر کا اضافہ کیا ہے ۔ تاہم چونکہ اس کے خیالات پر آپ کی تعبیر دین کا ناپسندیدہ اثر ہے لہٰذا یہ اسلام کی صحیح ترجمانی کرنے والی جماعت نہیں ۔ اگر خدانخواستہ آپ اپنے ہی نظریہ کو صحیح سمجھتے ہیں تو میں سمع خراشی کی معافی چاہتے اور اگر آپ نے یہ مضمون بالاستیعاب پڑھنے کی زحمت فرمائی تو آپ کا بیحد شکریہ ادا کرنے کے علاوہ اور کیا کہہ سکتا ہوں ۔

وما علی الا البلاغ

متلاشی حق للمبین

احقر العباد کریم الدین ریٹائرڈ انجینئر

(یوپی دھند)

ضمیمہ

(مشتمل بر چند مختصر اقتباسات)

جو "منصب نبوت اور اسکے عالی مقام حاملین" (مصنفہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی) کے خطبۂ دوم سے ماخوذ ہیں۔

مولانا علی میاں صاحب نے مارچ ۱۹۶۳ء میں چھ خطبے مدینہ یونیورسٹی میں فضیلت مآب شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز، حال چانسلر مدینہ یونیورسٹی اور صدر رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کی درخواست پر پڑھے تھے اگرچہ ان اقتباسات کا خلاصہ گزشتہ صفحات میں آچکا ہے تاہم ایک مشہور عالم دین اور مفکر اسلام کی زبان سے سننا بہر حال موجب برکت و زیادت اثر ہوگا۔

انبیاء اور دوسرے رہنماؤں کا بنیادی فرق

انبیاء جس علم کی لوگوں میں نشر و اشاعت کرتے ہیں اور جس عقیدہ کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے ہیں اور جس پیغام کی تبلیغ کی ذمہ داری ان کے سپرد کی جاتی ہے وہ نہ تو ان کی ذہانت کی پیداوار ہے، نہ اس فاسد اور تکلیف دہ صورت حال کا ردِ عمل ہے جس میں وہ زندگی گزارتے ہیں۔ —— بلکہ اس کا منبع و ماخذ وحی آسمانی اور الٰہی پیغامات ہیں۔ جن کے لئے وہ منتخب کئے گئے ہیں۔ لہٰذا کبھی بھی دوسرے حکماء، زعماء، مصلحین اور ان تمام رہنماؤں پر اُن کو قیاس نہیں کیا جاسکتا جن کا انسانیت اور اصلاح و عزیمت کی طویل تاریخ نے تجربہ کیا ہے۔ جو یا تو معاشرہ کی پیداوار ہوتے ہیں یا اپنی حکمت و ذہانت کا نتیجہ، یا ماحول کی صدائے بازگشت یا اپنے اردگرد کے

ہوئے فساد اور انارکی کے لاوہ کا ردِ عمل اور اس کے خلاف ایک صدائے احتجاج۔

اس ردِ عمل کے اثرات (جو بعض اوقات بلا خوردبین نہیں دیکھے جا سکتے) بہت سے ان اسلام پسند مصنفین اور داعیوں کی تحریروں میں نظر آتے ہیں جن کو موجودہ مادی فلسفوں، مغربی سیاست و اقتدار کی کامیابی، اور اپنے ملک کے مسلمانوں کی غیر منظم زندگی یا غلامی نے اسلام کے مطالعہ، صورتِ حال کا مقابلہ کرنے اور ان فلسفوں اور نظام ہائے حیات کے متوازی اسلامی فلسفہ اور نظامِ حیات کے پیش کرنے پر آمادہ کیا۔ ان کی تحریروں اور تعبیروں اور ان کے طریقِ فکر میں اس "ردِ عمل" کے عکس اور سائے اس شخص کو آسانی کے ساتھ نظر آسکتے ہیں جس کو ماحول کے اثرات اور عمل اور ردِ عمل سے آزاد ہو کر کتاب و سنت کے براہِ راست مطالعہ کا موقعہ ملا ہے۔

ان جدید تحریروں اور رہنماؤں اور نائبین انبیاء، مجددین و مصلحین کی دعوت و فکر میں ——— ایک واضح فرق محرکاتِ عمل و مقاصد کا ہے۔ پہلے گروہ کی کوشش و فکر کا بڑا محرک حصولِ قوت و اقتدار یا غلبہ و عزت، اسلامی ریاست کا قیام، اور حیاتِ انسانی کا نظم و سکون اور ثانی الذکر کا اصل محرک رضاء الٰہی کا حصول، آخرت کی کامیابی، ایمان و احتساب کا جذبہ اور اتباعِ نبوی اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کا شوق ہے اور انہیں جیسے لوگوں کے لئے کہا گیا ہے۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ○ وہ جو آخرت کا گھر ہے ہم نے اُسے ان لوگوں کے لئے تیار کر رکھا ہے جو ملک میں ذاتی سربلندی اور فساد کا ارادہ نہیں کرتے اور انجام نیک تو پرہیزگاروں ہی کا ہے۔ (القصص ۸۳)

وہ رہنما جن کے پیغامات اور جن کی جد و جہد ان کے ماحول، تہذیب و تمدن اور ان کے احساس و شعور کی پیداوار ہوتی ہے ——— یہ ہمیشہ مصلحت اور ضرورتِ وقت کا لحاظ رکھتے ہیں۔ اکثر حالات کے سامنے جھک بھی جاتے ہیں، جس کے نتیجہ میں بعض اصولوں کو ترک کرنا پڑتا ہے اور کبھی دوسری جماعتوں سے معاملہ بھی کرتے ہیں۔ "لین دین" کا طریقہ اپناتے ہیں اور ان میں سے اکثر کا اصول یہ ہوتا ہے۔

"چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی"

(اس سلسلہ میں احقر مولف عرض کرتا ہے کہ جماعت اسلامی کے دور اول قبل از تقسیم ہند اور دور ثانی بعد از تقسیم کا حال "تحریک جماعت اسلامی کا ایک تحقیقی مطالعہ" مصنفہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سے پڑھ لینا کافی ہوگا)

دعوتِ انبیاء کا سب سے اہم رکن

جس شخص کو قرآن سے کچھ بھی تعلق ہے (جو تمام پچھلی کتابوں کی تعلیمات کا جامع ہے) اس کو یقینی اور بدیہی طور پر یہ بات معلوم ہوگی کہ انبیاء کی تعلیم کا بنیادی مقصد توحید ہے، یہی ان کی دعوت کا اساس اور اصل مرکز تھا۔ ان کی سرگرمیاں اسی کے گرد گھومتی تھیں۔ وہ یہیں سے آگے بڑھتے تھے اور یہیں واپس لوٹتے تھے، یہیں سے شروع کرتے تھے اور پھر یہیں آکر ختم کرتے تھے۔

قرآنی اصلاحات صحابہؓ کی نظر میں

یہی شرک و بت پرستی (مابعد الطبیعاتی حدود کے اندر ہی) اپنی تمام واضح اور غیر واضح شکلوں کیساتھ، ہر زمانہ، ہر ماحول اور ہر معاشرہ میں انبیاء کرام کے جہاد کا موضوع رہی ہے، اسی نے جاہلیت کی آتش غضب کو بھڑکایا اور وہ چیخ پڑے

اَجَعَلَ الاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا، اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ ۝

"کیا اتنے معبودوں کی جگہ ایک ہی معبود بنادیا، یہ تو بڑی عجیب بات ہے"

اور جس صاحب عقل و فہم نے بھی عہد نبوی کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہو اور صحابہ کرامؓ کے حالات سے باخبر ہو، اس کو اس امر میں ذرا بھی شبہ نہ ہوگا ——— کہ انہوں نے "اله" "رب" "عبادت" اور "دین" سے بھی ان کلمات کا صرف دینی مفہوم ہی سمجھا ہے اور ان کے اسالیب کلام سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اقوال و آثار میں بے شمار مقامات پر یہی مفہوم مراد ہے اور اس میں کسی کا بھی اختلاف نہیں۔

احقر کہتا ہے کہ سارے قرآن میں محض ایک جگہ سورۂ یوسف میں "دین" "قانون" کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے اور آیت یکون الدین کلہ للّٰہ میں جن ائمہ کے نزدیک مشرکین عرب سے جزیہ نہیں لیا جاتا، ان کے نزدیک دین کا مطلب یہاں نظام اطاعت یا حکومت الہیہ ہے، مگر ان دو مستثنیات کی وجہ سے دین کے عمومی مفہوم پر اثر نہیں پڑتا۔

نوجوان داعیوں اور انشا پردازوں سے

عزیز نوجوانو! ــــــ تم اپنی دانش گاہ سے انشاء اللہ داعی اور مصلح انشا پرداز اور مصنف اور قائد و رہنما بن کر نکلو گے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہاں تم کو ایک نصیحت کرتا چلوں جو طویل مطالعہ کا حاصل اور تجربات کا نچوڑ ہے، اور تم اس کی صحیح اہمیت اور اس کی قدر و قیمت طویل تجربات کے بغیر نہیں سمجھو گے۔

خبردار! تمہاری تحریریں اور اسلام، اس کے حقائق اور اس کے پیش کرنے کا تمہارا انداز ہرگز قاری کو یہ تاثر نہ دینے پائے۔ کہ سلام اس طول و طویل مدت میں مستقل جہالت کی تاریکیوں میں بھٹکتے رہے اور دین کو صحیح طور پر نہ سمجھ سکے (جیسا کہ بعض جماعت اسلامی والوں کا خیال ہے کہ دور صحابہؓ کے بعد مسلمانوں میں کوئی شخص ایسا پیدا نہیں ہوا جس نے اسلام کو مولانا مودودی کی طرح ٹھیک ٹھیک سمجھا ہو۔ احقر مولف) جو کہ ہر زمانے اور ہر ماحول کا دین ہے، اسی طرح قرآن کی بنیادی اصطلاحات اور تعبیروں کو سمجھنے سے بھی قاصر رہے۔ کیونکہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس طویل مدت میں یہ کتاب غفلت اور جہالت کی نذر رہی۔ اس کے حقائق کو سمجھا نہیں جا سکا اور نزول کے تھوڑی مدت بعد اس سے استفادہ کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ یہ تصور قرآن کی آیت مبارکہ ــــ "اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ" کے بالکل خلاف ہے، کیونکہ فضل و احسان کے موقع پر حفاظت کے وعدہ میں اس کے مطالب کا فہم، ان کی تشریح، اس کی تعلیمات پر عمل اور زندگی میں ان کا انطباق بھی شامل ہوتا ہے اور ایسی کتاب کی کیا قدر و منزلت ہو سکتی ہے جو طویل مدت تک معطل پڑی رہے نہ سمجھی جائے، نہ اس پر عمل کیا جائے۔

غور کا یہ انداز جسے دورِ حاضر کے بعض مفکرین اور انشا پرداز اختیار کر رہے ہیں اس ابدی اور انقلاب آفریں صلاحیتوں اور کارناموں سے بھرپور امت پر ایک طویل المیعاد فکری قحط اور ذہنی اور علمی تعطل کا الزام عاید کرتا ہے ــــ جو درخت اپنی زندگی کی بہترین مدت میں برگ و بار نہ لائے۔ اور بے حاصل و بے ثمر پڑا رہے اس کی افادیت اور فطری صلاحیت مستقل طور پر مشکوک ہو جاتی ہے اور اس سے مستقبل میں

بھی کسی بھلائی کی امید کرنی مشکل ہے۔[1]

یہ نتیجہ اگرچہ بادی النظر میں کچھ زیادہ اہم و سنگین نہ معلوم ہو مگر اس کے اثرات ذہن و دماغ اور طرزِ فکر پر بڑے گہرے اور دور رس ہیں۔ اس لئے کہ یہ امت کی صلاحیت ہی میں

---

[1] یہاں نمونہ کے طور پر مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی بانی جماعت اسلامی کی مشہور کتاب "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحات" کے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔ مصنف اِلٰہ، رب، دین اور عبادت کے قرآنی کلمات اور اسلامی اصطلاحات کا ذکر کرنے اور یہ ثابت کرنے کے بعد کہ نزول قرآن کے وقت اس کا ہر مخاطب، جس کی زبان عربی تھی، ان چار بنیادی اور قرآنی اصطلاحوں کے صحیح معنی اور مفہوم سے آشنا تھا لکھتے ہیں:۔

"لیکن بعد کی صدیوں میں رفتہ رفتہ ان سب الفاظ کے وہ اصل معنی جو نزول قرآن کے وقت سمجھے جاتے تھے بدلتے چلے گئے، یہاں تک کہ ہر ایک اپنی پوری وسعتوں سے ہٹ کر نہایت محدود بلکہ مبہم مفہومات کے لئے خاص ہوگیا۔"

(قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" صہ")

پھر اس کے وجوہ و اسباب بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں

"نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن کے اصل مدعا کا سمجھنا لوگوں کے لئے مشکل ہوگیا" (صہ)

پھر اس غلط فہمی کے نتائج بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"پس یہ حقیقت ہے کہ محض ان چار بنیادی اصطلاحوں کے مفہوم پر پردہ پڑ جانے کی بدولت قرآن کی تین چوتھائی سے زیادہ تعلیم بلکہ اس کی حقیقی روح نگاہوں سے مستور ہوگئی ہے اور اسلام قبول کرنے کے باوجود لوگوں کے عقائد و اعمال میں جو نقائص نظر آرہے ہیں ان کا ایک بڑا سبب یہی ہے" (ص۶)

ان عبارات کا پڑھنے والا جس کا مطالعہ گہرا اور وسیع نہیں ہے اور جو اس حقیقت سے واقف نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو عام گمراہی اور دین سے ایسی ناآشنائی سے محفوظ رکھا ہے جو زمان و مکان کی حدود سے بے نیاز ہو کر ساری امت پر سایہ فگن ہو، یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ قرآن

شک و شبہ پیدا کر دیتا ہے جو نہ صرف اس دین و پیغام کی حامل ہے بلکہ اس کو دنیا میں پھیلانے، اس کی تشریح کرنے اور اس کی حفاظت کی بھی ذمہ دار ہے اور اس امت کی گزشتہ تاریخ، اس کے مجددین، مصلحین اور مجتہدین کے علمی اور عملی کارنامے بھی مشکوک اور کم قیمت ہو جاتے ہیں اور آئندہ کے لئے یہ بات بھی مشتبہ ہو جاتی ہے کہ جو کچھ کہا اور سمجھا گیا ہے وہ صحیح ہے اور جو کچھ کہا اور سمجھا جائیگا وہ ہر شک و شبہ سے بالاتر ہوگا۔ اس سے "ظاہر و باطن" اور "مغز و پوست" کے اس فلسفہ اور دینی حقائق کو ایک نہایت عسیر الفہم معمہ اور چیستان قرار دینے کی سعی کو شہ ملتی ہے جس سے باطنیوں کے مختلف فرقوں نے مختلف زمانوں میں فائدہ اٹھایا ہے۔

نیز اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو جا بجا ——— "الکتاب المبین" ——— اور ——— "عربی مبین" کے الفاظ سے یاد کیا ہے اور ایک جگہ اس کی آیات کے محکم اور مفصل ہونے کا ذکر کیا ہے۔ یہ صفات اور تعریفیں بھی اس خیال کے منافی ہیں کہ قرآن مجید کے متعدد بنیادی حقوق طویل عرصہ تک پردۂ اخفا میں رہے ——— (امت کی اس حالت کو ضلالت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے حالانکہ کتاب و سنت اور احادیث کے ذخیرہ سے مجموعی اور اصولی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ امم سابقہ کے برخلاف یہ امت کسی دور میں بھی عمومی اور عالمگیر ضلالت میں مبتلا نہیں ہوگی ——— "لا تجتمع امتی علی ضلالۃ" ——— مشہور حدیث ہے جس کے مشہور محدث و ناقد حدیث علامہ سخاوی کی رائے کے مطابق اسانید کثیر اور شواہد متعدد موجود ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس اندازِ فکر میں اس اہمیت و مقبولیت کو بھی بڑا دخل ہے

مجید کی حقیقت ایک طویل مدت تک امت کی (یا زیادہ محتاط الفاظ میں امت کے اکثر افراد کی) نگاہ سے اوجھل رہی اور امت بحیثیت مجموعی ان بنیادی الفاظ کی حقیقت ہی سے بے خبر رہی۔ جن کے گرد اس کتاب کا پورا نظام گردش کرتا ہے اور جن پر اس کی تعلیمات اور دعوت کی عمارت قائم ہے ا... یہ پردہ اس صدی کے وسط ہی میں اٹھ سکا (اور صرف مولانا مودودی ہی نے اٹھایا، جیسا کہ اوپر جماعت اسلامی والوں کا خیال ظاہر کیا جا چکا ہے)

(احقر مؤلف)

جو ہمارے زمانہ میں سیاسی اقتدار، سیاسی اداروں اور تنظیموں نے حاصل کرلی ہے۔ اسلامی نظام کا اجراء حکومت الہیہ کا قیام اپنی جگہ نہایت صحیح اور ضروری مقاصد ہیں، جن میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں، مسلمان اہل فکر اور اہل قلم کا فرض ہے کہ اپنی تمام توانائیاں اور پوری صلاحیتیں اس مقصد عظیم کے حصول میں لگادیں لیکن اس مقصد کے لئے قرآن مجید کی آیات و اصطلاحات سے بے تکلف اپنے مدعا کو ثابت کرنے اور سارے قرآن کو اسی رنگ میں دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ ان کی ترغیب و تاکید اور ان کی اہمیت و عظمت کے ثبوت کے لئے کتاب و سنت کے ذخیرہ میں واضح دلائل و نصوص موجود ہیں (جن کی روشنی و رہنمائی میں سردور کے صحیح الفہم اور عالی ہمت مسلمان مصلحین اور داعیوں نے کوشش کی) ان کی موجودگی میں ان تکلفات کی کوئی حاجت نہیں[1] (یہاں تک کہ دین کا مقصود ہی حکومت الہیہ کا قیام قرار دے دیا جائے جیسا کہ مولانا مودودی کہتے ہیں۔ احقر مولف)

نصیحت اور موعظت کا اصل محرک

آخرت پر ایمان اور وہاں ملنے والی ابدی سعادت اور لازوال شقاوت اور ان تمام انعامات (جو نیک بندوں کے لئے اللہ نے مہیا فرمائے ہیں) اور تمام عذابوں (جو کفار کے لئے تیار کئے گئے ہیں) کا ہر وقت نگاہوں کے سامنے ہونا، یہی امتیاز انبیاء کرام کی دعوت اور ان کی پند و نصیحت کا اصل محرک ہے —— انبیاء کرام سے بعید بلکہ ناممکن ہے کہ وہ

---

[1] راقم السطور کو ایک مسلمان کے مقالہ کا حال ہی میں سننے کا موقع ملا کہ جس میں انہوں نے ثابت کیا ہے کہ قرآن میں صلوٰۃ سے مراد حکومت اسلامی اور اقتدار ہے جہاں جہاں صلوٰۃ کا لفظ مطلق آیا ہے اس سے مراد علاقائی حکومت ہے اور جہاں "الصلوٰۃ الوسطیٰ" کا لفظ آیا ہے اس سے مراد مرکزی حکومت ہے۔ —— یہ اسی طرز فکر کا ایک نمونہ ہے۔ جو کہ ایک مقصد اور مرکزی فکر کو سامنے رکھ کر سارے قرآن مجید یا دینی ذخیرہ کو اس کے مطابق بنانے اور اس سے اپنے مدعا کو ثابت کرنے کی کوشش سے پیدا ہوتا ہے۔

(فاضل کیساتھ مولانا مدظلہ کو "کالجاہل" بھی لکھنا چاہیئے تھا کیونکہ ایسا شخص یقیناً فاسق ہے۔ جس کی تعظیم شرعاً جائز نہیں، احقر مولف)

(معاذاللہ) اپنی امت کو ستیاد حکومت یا دنیاوی منفعت کا لالچ دلائیں اور ان منافع کو ان کے ایمان کی قیمت اور اپنی دعوت قبول کرنے کا معاوضہ بتائیں، بلکہ اس کے خلاف حُب جاہ، شخصی یا قومی بلندی اور حوصلہ مندی کے تحت سربلندی اور لوگوں پر غلبہ و استیلا کی پرزور مخالفت کرتے ہیں۔ قرآن بہ بانگِ دہل اعلان کرتا ہے۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝

"وہ جو آخرت کا گھر ہے۔ ہم نے اُسے اُن لوگوں کے لئے تیار کر رکھا ہے جو ملک میں ذاتی سربلندی اور فساد کا ارادہ نہیں کرتے اور انجام نیک تو پرہیزگاروں ہی کا ہے" (القصص ۸۳)

نبوی اور اصلاحی دعوتوں کا فرق

انبیاء کی آخرت پر ایمان کی دعوت اور اس کی اہمیت کی تبلیغ و تشہیر صرف اخلاقی یا اصلاحی ضرورت کے تحت نہیں تھی۔ جس کے بغیر اسلامی معاشرہ کیا، کوئی بھی معاشرہ وجود میں نہیں آسکتا۔ نہ پاکیزہ تمدن کی بنیاد پڑ سکتی ہے۔ یہ طرزِ فکر بھی اگرچہ قابل تعریف ہے۔ لیکن انبیاء کے طریق کار، ان کی سیرت اور ان کے خلفاء کے طریق کار سے بالکل مختلف ہے یہ حضرات آخرت کے متعلق گفتگو کرتے ہیں تو تڑپ اور وابستگی اور لذت کیساتھ اور اس کی طرف دعوت دیتے ہیں تو جوش اور قوت کیساتھ ______

اور دوسرے لوگ اس بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو اخلاقی یا معاشرتی ضرورت کی حد تک اور اصلاح یا اخلاقی تنظیم کے جذبہ سے، دونوں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے (اسلام کو محض ایک بہترین نظامِ حیات کے طور پر پیش کرنے والے حضرات اس پر غور فرمائیں کہ کبھی انہوں نے اسلام قبول کرنے پر جنت اور اس کی روگردانی پر دوزخ ملنے کا ذکر بھی ایسی وارفتگی، جوش اور قوت کے ساتھ کیا ہے۔ گویا وہ بدیہیات کی طرح ان کے ایمان میں داخل ہے۔ احقر مولف)

تکلفات سے پرہیز اور فطرت سلیمہ پر اعتماد

انبیاء کی تعلیمات جس طرح سادہ اور بے تکلف زندگی گزارنے والی قوموں کے حالات سے مطابقت رکھتی ہیں، اسی طرح بلند تہذیب اور تمدن رکھنے والی قوموں کی حالت کے بھی موافق ہوتی ہیں۔ وہ نہ دقیق اور پیچیدہ سوالوں کو اٹھاتے ہیں اور نہ انہیں ضروری قرار دیتے ہیں ان کلام میٹھے اور خوشگوار پانی کی طرح ہوتا ہے۔ ہر شخص اس کو استعمال کرتا ہے اور اس کا ضرورت مند بھی رہتا ہے۔

امام فخرالدین رازیؒ (متوفی ۶۰۶ھ) کہتے ہیں (جیسا کہ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ اپنی کتابوں میں بار بار نقل کرتے ہیں)

"میں نے کلامی طریقوں اور فلسفیانہ اصولوں میں بہت غور کیا۔ لیکن میں نے نہیں دیکھا کہ وہ کسی بیمار کو شفا دیتے ہیں یا کسی پیاسے کی پیاس بجھاتے ہیں اور (انسانی ذہن سے) قریب ترین انداز میں قرآن کے انداز کو پایا، اور جو کوئی بھی میری طرح تجربہ کریگا اس کو یہی بات نظر آئیگی۔"

مصنوعی انداز کلام، طرزِ استدلال اور دعوت و تنظیم کے جدید اصولوں نے بڑی زیادتی کی ہے یہاں تک کہ لوگ انبیاء کے طریقوں اور ان کی سیرتوں سے غافل ہوگئے، بلکہ ان کے استخفاف تک پہنچ گئے اور فہم قرآن ان کے لئے بہت مشکل اور پیچیدہ ہوگیا۔ اب حال یہ ہے کہ وہ اس کے حکیمانہ اسلوب سے لطف اندوز ہونے کی استطاعت ہی نہیں رکھتے اور تاویلات و تکلفات کا سہارا لینے لگے ہیں، حالانکہ آج تک دعوت و تبلیغ میں انبیاء کی سیرت ہی مثالی سیرت ہے اور قرآن کا اسلوب ہی فطری، بلیغ اور حکیمانہ اسلوب ہے، جس پر ہر زمانہ کی عقلیں مطمئن ہوتی ہیں اور دلوں کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابوالاعلیٰ مودودی

۵-اے ذیلدار پارک - اچھرہ
لاہور - ۱۲ (پاکستان)

فون نمبر ۴۱۱۰۱۷
حوالہ نمبر ۸۳۳
مورخہ ۲۹/۴/۷۶

محترمی و مکرمی، السلام علیکم و رحمۃ اللہ!

آپ کا خط ملا - اس کے ساتھ آپ کے کتابچے کا مسودہ بھی وصول ہوا اور مطالعہ میں آیا، جس میں آپ نے میری پیش کردہ دین کی بعض تعبیرات اور تشریحات کی تردید و تغلیط کی ہے - بعض دوسرے حضرات بھی یہ خدمت انجام دے چکے ہیں اور دے رہے ہیں - ان کے کام میں آپ کے نزدیک کوئی کسر باقی تھی اسے پورا کرنے کی کوشش آپ نے کردی ہے - اب آپ اپنے نتائج افکار اہل دنیا کے سامنے پیش کریں تاکہ وہ آپ کے نقطۂ نظر سے باخبر ہوں اور عنداللہ و عندالناس آپ بری الذمہ ہوں، اس سلسلہ میں مزید مجھے کچھ لکھنے یا بھیجنے کی زحمت گوارا نہ فرمائیں -

آپ کا خط چونکہ جدے سے آیا ہے اس لئے اس کا جواب اس پتے پر ارسال خدمت کیا جا رہا ہے اور کتابچہ چونکہ کراچی سے آیا ہے اس لئے اسے وہیں واپس بھیجا جا رہا ہے -

خاکسار

ابوالاعلیٰ

جوابُ الجواب

پوسٹ بکس نمبر ۳۷۵۹
جدہ (سعودی عربیہ)
۱۹ر مئی ۱۹۷۶ء۔

مولانا محترم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ ، خدا کرے آپ مع متعلقین بہمہ وجوہ مع الخیر ہوں ۔ آپ کا خط نمبری ۳۳۸ مؤرخہ ۲۹ر اپریل ۱۹۷۶ء موصول ہو کر باعثِ افتخار ہوا۔

یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ آپ نے میرے مرسلہ کتابچہ کا مطالعہ فرمانے کی زحمت فرمائی ، مگر ساتھ ہی آپ کے اس جملے سے ـــــ "اس سلسلہ میں مزید مجھے آئندہ کچھ لکھنے یا بھیجنے کی زحمت گوارا نہ فرمائیں"۔ افسوس بھی ہوا۔ کیونکہ اول تو جیسا کہ اس کتابچہ کے صفحہ ۵ پر میں نے لکھا بھی ہے ، مجھے یہ ہمت آپ کے قول مندرجہ صفحات ۱۱، ۱۲ ـــــ "تحریکِ اسلامی کی اخلاقی بنیادیں" ـــــ کے بموجب ہی پڑی تھی ۔ اگر مجھے یہ یقین ہوتا کہ آپ کا یہ قول محض برائے گفتن ہے ، اور آپ اس سلسلہ میں افہام و تفہیم کا دروازہ بند فرما چکے ہیں ، تو میں ہرگز وہ کتابچہ آپ کو نہ بھیجتا۔ دوسرے میں نے اس کتابچہ میں کوئی چیز عناداً ، اخلاقی معیار سے گری ہوئی یا سوقیانہ سب و شتم پر مشتمل بھی نہیں لکھی تھی جو تکدرِ طبع کا باعث بن کر آپ کو ایسا لکھنے پر مجبور کرتی۔

جناب کے وسیع علم اور بالغ نظری کا تقاضا تو بخیالِ احقر یہ تھا کہ اگر میرے استدلالات آپ کی تعبیرِ دین و مقصودِ دین کی تردید و تغلیط میں آپ کے نزدیک غیر معقول و نادرست تھے آپ ان کی غلطی ظاہر فرما کر مجھے اپنے علم سے استفادہ اور اصلاحِ حال کا موقع عطا فرماتے لیکن اس کے بجائے آپ نے مجھے اپنے نتائجِ افکار کو اہلِ دنیا کے سامنے پیش کرکے عنداللہ و عندالناس بری الذمہ ہونے کا مشورہ دیا ہے ۔ اس میں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ وہ نتائجِ افکار یا تو ہدایت ہیں یا گمراہی ۔ اگر ہدایت ہیں تو آپ کی ان سے اس درجہ بیزاری کہ وہ

کتابچہ اپنے پاس رکھنے تک کے بھی روادار نہ ہوں چہ معنی دارد؟ - اور اگر وہ گمراہی ہیں تو آپ اس کا سدباب کرنے کی بجائے مجھے لوگوں کو گمراہ کرنے کا ذریعہ بننے کی اجازت کیوں عطا فرمارہے ہیں؟ کیا اس طرح بلا روک ٹوک ہر شخص کو اپنے خیالات کی اشاعت، ذرد میج کا موقع دینے سے مسلمان لاتعداد جماعتوں میں تقسیم ہوکر مسلمانوں کے اجتماعی ضعف اور اسلام کو ایک پہیلی اور چیستان بنا دینے کا موجب نہیں گے؟ ڈاکٹر امبید کرانجہانی نے بہت ٹھیک کہا تھا کہ:-

"دوسروں کو اسلام کی تلقین کرنے سے پہلے مسلمانوں کو یہ طے کر لینا چاہیئے کہ اسلام فی الواقع ہے کیا"!

غرض احقر کے خیال ناقص سے تو کسی غلطی کی ترویج کو روکنے کے لئے حتی الامکان کوشش کرنی چاہیئے، ورنہ نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ رفتہ رفتہ ہر شخص کا ایک علیحدہ مذہب ہوجائے اور کسی کی کوئی نہ سنے آج اگر قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا ہے۔ تو کل کسی دوسرے مکتب خیال کے لوگوں کو ان کی صف میں کھڑا کیا جائے گا۔ پس احقر کے خیال سے تو ایسا وقت آنے سے قبل علماء و زعمار اسلام کو ایک دوسرے سے مل کر اسلام کی ایک متفق علیہ تعبیر کی تعیین کرنا، اور اس پر عوام کو عمل پیرا ہونے کی ایک منظم کوشش کرنا اسلام کی بڑی خدمت ہوگی۔

مع خراشی کی معافی چاہتے اور اللہ سے سب کی اصلاح کی دعا پر ختم کرتا ہوں

والسلام!

آپ کا ہمیشہ کی طرح سے مخلص

احقر کریم الدین

ریٹائرڈ انجینئر

مَعذِرَتِ مؤلّف و اَغلاط نامہ

احقر مؤلف قارئین کرام سے مخلصانہ طور پر معذرت خواہ ہے کہ اس کی ناتجربہ کاری کی وجہ سے باوجود اختیاری احتیاط برتنے کے کتاب میں کثیر التعداد علامات اوقاف کی غلطیوں کیساتھ بہت سی لفظی غلطیاں بھی رہ گئیں۔ جن میں سے بعض جو زیادہ اہم ہیں اغلاط نامہ کے طور درج ذیل کی جاری ہیں کتاب میں اس کے مطابق ترمیم و تصحیح فرمالیں۔ باقی لفظی غلطیاں اور علامات اوقاف کی غلطیاں امید ہے کہ قارئین کرام خود ہی سمجھ کر حسب ضرورت درست فرمالیں گے۔

- صفحہ ۲۳۔ سطر ۱۷ — "مثلاً" کے بعد جو لمبا ڈیش لگا ہے اور اس کے بعد گرمیوں میں لکھا ہے تو گرمیوں میں "کو مثلاً کیساتھ ملایا جاوے پھر ڈیش کھینچ کر لفظ نیز بڑھایا جاوے
- ۲۴ - ۱۸ — "صحت" کی بجائے "حیثیت" بنالیں۔
- ۲۹ - ۱۴ — وادی محشر میں لفظ محشر غلط ہے۔ محَسّر بنالیا جاوے۔
- " - ۱۵ — ذبح کیش نہیں بلکہ کَبش ہے (یعنی مینڈھا)
- - ۱۷ — ابرحمہ کی بجائے "اَبرَہہ" بنالیا جائے۔
- ۳۵ - ۴ — لفظ غالباً کے بجائے "یعنی" ہونا چاہیے۔
- " - ۵ — "یہ بھی ثابت رہا ہے" میں سے "رہا" کاٹ دیا جاوے۔
- ۳۷ - ۱۰ — "شروع" کی بجائے "شُروع" بنالیا جاوے
- " موٹی سرخی کے بعد تیسری سطر — پہلی بار جو "جہاد افضل" اس سطر میں آیا ہے، اس کی جگہ "جہاد اکبر" اور دوسری بار والے کو "افضل جہاد" بنالیا جاوے۔
- ۳۹ - ۱۲ — سطر کے آخری لفظ "ہے" کی بجائے "وغیرہ" لکھ لیا جاوے۔
- ۴۰ - ۱۷ — مزاحمت "متوقیہ" کے بجائے "مزاحمت متوقعہ" بنالیا جاوے
- ۴۱ - ۱ — دشمنوں کا" اور "جہاد" کے درمیان "بطور پولیس الحیتن کے" بڑھالیا جائے۔
- " - ۰ — شروع کا لفظ "یہ" کاٹ کر "یا" بنالیں۔
- ۴۲ - ۱ — "عام" کے بعد جو "لوگوں" ہے وہ زائد ہے حذف کر دیا جائے

- ۴۲ - شعر سے نیچے پہلی سطر - شروع میں لفظ "اور" بڑھا لیا جائے (اور دور نبوی ہو جائیگا)
- ۴۲ - ۱۸ } ۵۸ - ۱۸ } دونوں جگہ لفظ عادلانہ کی بجائے "عادلہ" بنا لیا جائے۔
- ۴۴ - ۱۰ "لوہا منوا سکیں" غلط ہے "لوہا لے سکیں" بنا لیا جائے۔
- ۴۵ - ۲۰ بجا آوری کے بعد "دو کیں" بھی لکھ لیں۔
- ۴۶ - ۱۸ "کم ہوگا" کے بعد "جیسا کہ ظاہر ہے" بڑھا لیا جائے
- ۵۰ - ۵ "سوء ظنی ہے" کے بعد "جو نامناسب" بڑھا لیا جاوے۔ لفظ "اقتباس" کے دونوں طرف نشان بنالیں
- ۵۲ - ۲ "تاہم" کے بجائے "پس" بنالیں اور "تھوڑے لوگ" کے بعد اس طرح بڑھالیں۔ لفظ بڑھا یا بنا پسند کریں کے بعد یہ طویل عبارت بڑھالیں "پس" سے قبل:
"یہ دعوت کوئی مفصل تبلیغی انداز کی نہ ہوتی تھی کیونکہ اشاعت اسلام کافی ہو چکی تھی اور بہت سے دور دراز کے لوگ بھی اسلام لا چکے تھے۔"
- ۵۵ - ۶ اگر ہوں بھی تو اس کے لئے "میں کیلئے" کے بجائے "سے" بنا لیا جائے (یعنی اس)
- ۵۶ - ۱ "آیت ۳ تا ۹" نہیں بلکہ "۳ تا ۵" ہے۔ ۹ کی جگہ ۵ بنا لیا جائے۔
- ۶۳ - ۱۱ لفظ "صبا" نہیں "سبا" ہے درست فرمالیں۔
- ۶۵ - ۱۶ لائن کے شروع میں لفظ "میں" کاٹ کر "کے لئے" لکھ دیا جاوے۔
- ۶۶ - ۱ "مولانا مولانا مودودی" کو "مولانا محترم مودودی صاحب" بنالیں
- ۶۷ - ۱۱ "اجناب" کی بجائے "اجنات" بنالیں۔
- ۶۸ - ۱۸ "منہ کو موڑیں" کو "حق سے منہ موڑیں" بنالیں
- ۶۹ - ۱۶ "نظام ہائے" کے بجائے "نظام ہائے کفر" بنالیں یعنی لفظ کفر بڑھالیں۔
- ۷۰ - ۲ (سرخی کی) نظام کے بعد لفظ کفر بڑھالیں۔
- ۷۵ - ۱۹ عموماً کوئی دقّت ان میں محسوس نہیں کرتے۔ لفظ دِقّت ایسا لکھا ہے کہ "وقت" پڑھا جاتا ہے۔ ضروری اعراب لگالیں۔
- " - ۲۰ اس میں لفظ دقت کے نقطے ٹھیک نہیں لگے۔ ٹھیک کرلیں۔
- ۷۹ - آخری چار سطریں - چونکہ مولانا علی میاں کی نہیں بلکہ مؤلف کی ہیں۔ لہٰذا شروع اور آخر میں ایک ایک قوس بنا دیں اور "اختر" کے بعد مولف ضرور لکھ دیں۔

تجارتِ آخرت

دنیا میں جمع کردہ مال و دولت بالآخر دوسروں کے کام آتی ہے۔ مگر دینی اور رفاہی کاموں پر لگایا ہوا سرمایہ انسان کے اس وقت کام آتا ہے جب وہ خالی ہاتھ دوسری دنیا میں پہنچتا ہے اس لئے کچھ سرمایہ آخرت کے بینک میں بھی محفوظ کرنے کی فکر و کوشش کرنی چاہیئے، اور اس کی بہترین صورت تبلیغ دین پر خرچ کرنا ہے جس کے لئے انبیاء علیہم السلام بھیجے گئے اور جو ہر مسلمان پر فرض کفایہ ہے، یہ اسی فرض کو بھلا دینے کا نتیجہ ہے کہ آج انسان اخلاقی آوارگی، ذہنی ارتداد، فکری انتشار اور لادینی اقدار کا شکار ہو رہا ہے ایسے وقت میں جبکہ شعائر اسلام مٹتے چلے جا رہے ہوں اور غیر ممالک سے انگریزی دینی لٹریچر مہیا کرنے کا شدید تقاضا ہو رہا ہو۔ یہ فرض کفایہ، فرض عین ہو جاتا ہے، اور بقول حضرت مجدد الف ثانی رح ایسے لادینی دور میں دین کو رواج دینے کے لئے ایک کوڑی خرچ کرنا اللہ کی راہ میں لاکھوں روپے خرچ کرنے کے برابر ہے۔

یہ ادارہ اسی فریضۂ تبلیغ کی ادائیگی کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ تاکہ جو حضرات دنیوی مصروفیات کے باعث یہ دینی فریضہ ادا نہیں کر سکتے۔ وہ اس ادارہ کے رکن بن کر گھر بیٹھے لٹریچر کے ذریعہ اندرون و بیرونِ ملک تبلیغ کر کے سرمایۂ آخرت جمع کر سکیں یا اس کے تبلیغی ماہنامہ مجلہ میں اشتہار دے کر مصداق "ہم خرما و ہم ثواب" اپنی تجارت بڑھا سکیں۔ یہ ادارہ مارچ ۱۹۶۵ء سے نہایت باقاعدگی کے ساتھ ہر ماہ ہزاروں کی تعداد میں دیدہ زیب اور دلنشین اردو لٹریچر نسل نو اور بیرونی ممالک میں مفت تقسیم کر رہا ہے۔ اب بیرونی ممالک کے لئے انگریزی میں دینی لٹریچر شائع کیا جا رہا ہے۔ یہ ادارہ کسی جماعت کا نقیب یا ترجمان نہیں، اس کا مقصد خالصۃً للہ دین کی خدمت ہے اور اس کے لئے آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔ تاکہ اسلام کا پیغام جاپان، کوریا، آسٹریلیا اور افریقہ وغیرہ تک پہنچایا جا سکے

فارم رکنیت مفت طلب کریں

منشی عبدالرحمٰن خان منیجنگ ڈائرکٹر عالمی ادارہ اشاعت علوم اسلامیہ رجسٹرڈ

پہ جھلیک۔ ملتان شہر — فون نمبر ۲۶۷۵